بانی : حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

مدیر : خالد سیف اللہ رحمانی

سہ ماہی مجلہ بحث و نظر حیدرآباد

شمارہ نمبر : ۱۱۴/۱۴	اکتوبر — دسمبر ۲۰۱۸ء	محرم الحرام — ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ

زرِ تعاون

اندرون ملک

ایک شمارہ: 40 روپے

سالانہ: 150، بذریعہ رجسٹری: 200

سہ سالہ: 450، بذریعہ رجسٹری: 550

بیرونِ ملک

ایشیائی ممالک کیلئے سالانہ: 20 امریکی ڈالر

یورپ، امریکہ، افریقہ کے لئے :

سالانہ: 30 امریکی ڈالر

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

Khalid Saifullah Rahmani, Baitul Hamd, H.No:16-182/1, Quba Colony, Po:Pahadi Shareef, Hyd. A.P 500005, Ph: 9989709240 E-mail: ksrahmani@yahoo.com

چیک/ ڈرافٹ پر صرف: "Khalid Saifullah" لکھیں

کمپیوٹر کتابت: محمد نصیر عالم سبیلی ''العالم'' اُردو کمپیوٹرس، حیدرآباد، فون نمبر: 9959897621 91+

فہرست مضامین

● ● ●

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

یکم اکتوبر ۲۰۱۸ء کو ایک ایسا تکلیف دہ واقعہ پیش آیا، جو مسلمانوں کی آنکھوں کو بے خواب اور کروٹوں کو بے سکون کر دے، مغربی یوپی کے معروف شہر باغپت کے قرب وجوار کے دیہات کا ایک خاندان —— جس کے سربراہ کا نام اختر علی ہے —— مسلم سماج کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مرتد ہو گیا، اور اس نے باضابطہ قانونی کارروائی کو انجام دیتے ہوئے تبدیلئ مذہب کا عمل کیا، ابتداءً تو ۲۰/ افراد کے مرتد ہونے کی خبر آئی، پھر اطلاع آئی کہ کچھ لوگ تائب ہو گئے ہیں اور ۱۲/ یا ۱۴/ افراد ارتداد پر قائم ہیں، اس کا محرک یہ نہیں ہے کہ انھیں اسلام میں کوئی کمی نظر آئی؛ بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ ۲۲/ جولائی کو اختر علی کے بیٹے گلزار علی کی لاش اس کی دوکان میں ملی، مرتد ہونے والے خاندان کا تاثر یہ ہے کہ یہ قتل اسی سماج میں مقتول سے مخاصمت رکھنے والے بعض مسلمانوں نے کیا ہے؛ لیکن اس کو انصاف دلانے میں مسلم سماج نے کوئی مدد نہیں کی، اس کے ردعمل میں ان لوگوں نے اجتماعی طور پر مرتد ہونے کا فیصلہ کر لیا، ظاہر ہے کہ مرتد ہونے والوں کی اس بات میں بظاہر کوئی وزن نہیں ہے، غلطی مسلمانوں کی ہو اور اس کا بدلہ اسلام سے لیا جائے، کیا یہ درست ہو سکتا ہے؟ پھر یہ کہ انصاف کی لڑائی عدالت میں لڑی جاتی ہے اور ظالم کے خلاف کارروائی پولیس کے ذریعہ عمل میں آتی ہے، تو ناراض تو انھیں پولیس سے ہونا چاہئے نہ کہ مسلم سماج سے، جو قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے۔

اس ناخوشگوار واقعہ کی تہہ میں دو خوشگوار پہلو بھی موجود ہیں، ایک یہ کہ جیسے بہت سے ہندو بھائی مذہب تبدیل کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہندو مذہب میں انھیں کیا خامی نظر آئی؟ مثلاً: عدم مساوات اور نابرابری، اس واقعہ میں مرتد ہونے والوں کو یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ انھوں نے مذہب اسلام میں فلاں فلاں خامی پائی ہے؛ اس لئے وہ مذہب تبدیل کر رہے ہیں؛ لہٰذا یہ مسلمانوں کی شکست؛ لیکن اسلام کی فتح ہے؛ البتہ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ ظالم کے مقابلہ مظلوم کی مدد کریں، اس فریضہ سے غفلت کا ردعمل بعض دفعہ کتنا سنگین ہوتا ہے، یہ اس کی ایک مثال ہے! دوسرے: مرتد ہونے والے خاندان کی متعدد خواتین نے اعلان کیا کہ وہ اسلام پر قائم رہیں گی اور ہرگز مذہب تبدیل نہیں کریں گی؛ حالاں کہ ان کے شوہر مرتد ہو چکے تھے، ان کے اس جذبۂ استقامت کو جتنی داد دی جائے کم ہے، اور جو لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں عورتوں کے ساتھ ظلم کیا جاتا ہے، یہ ان کے منھ پر طمانچہ ہے۔

لیکن مسلمانوں اور خاص کر علماء، مذہبی جماعتوں اور پیشواؤں کا فریضہ ہے کہ وہ اس بارے میں پوری فکر مندی سے کام لیں، مسلم سماج کو ایسے فتنوں سے بچائیں، جہاں جلسوں، اجتماعات اور جمعہ وعیدین کے خطبات میں اعمالِ صالحہ کی ترغیب دی جاتی ہے، وہیں مسلمانوں کو ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت بھی بتائی جائے، جیسے عملی گناہوں کی شناعت بیان کی جاتی ہے، اسی طرح کفر وشرک کی برائی بھی ان کے سامنے رکھی جائے، قرآن وحدیث سے بھی انھیں سمجھایا جائے اور عقیدۂ توحید کی معقولیت، اس کی کائنات کی فطرت سے مطابقت اور شرک کی نامعقولیت بھی انھیں سمجھائی جائے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ وضوء اور روزہ کے نواقض کے مسائل تو بتاتے ہیں؛ لیکن نواقض ایمان نہیں بتاتے، یعنی جن باتوں کی وجہ سے انسان کا ایمان ختم ہوجاتا ہے، ان کو بھی بتانا چاہئے، موجودہ حالات میں اس کی ضرورت واہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگوں کو ایمان اور ہدایت کی اہمیت سمجھائی جائے، کہ یہ نعمت اللہ تعالیٰ کی توفیق اور حُسنِ انتخاب سے ملتی ہے، رسول اللہ ﷺ کو بھیجا ہی گیا تھا انسانیت کی ہدایت ورہنمائی کے لئے، پھر بھی آپ سے فرمایا گیا کہ ضروری نہیں کہ آپ جسے چاہیں، وہ ہدایت پاجائیں، اللہ تعالیٰ اپنی مشیت خصوصی سے جس کو چاہتے ہیں، ہدایت سے نوازتے ہیں: ''اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ'' (القصص:۵۶) تمام رشتوں میں سب سے قربت کا رشتہ بیوی اور اولاد کا ہوتا ہے؛ لیکن حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیوی نیز حضرت نوح کی اولاد کے لئے ہدایت مقدر نہیں ہوسکی، (تحریم:۱۰-ھود:۵۶) عبداللہ بن سعد بن ابی سرح مسلمان ہوکر بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ نے اس کو وحی کی کتابت کرائی؛ لیکن اللہ کی طرف سے اس کے لئے ہدایت پر قائم رہنا مقدر نہیں تھا؛ اس لئے پھر مرتد ہوگیا، پھر فتح مکہ کے موقع سے اس نے توبہ کی اور حضرت عثمان غنیؓ کی سفارش پر آپ ﷺ نے اس کی توبہ قبول فرمائی، (مسند بزار، حدیث نمبر:۱۱۵۱) اسی لئے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر دُعاء سکھائی ہے: اے اللہ! ہدایت پانے کے بعد پھر ہمارے دل کو کجی میں مبتلا نہ فرمادیجئے: ''رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا''۔ (آل عمران:۸)

خالد سیف اللہ رحمانی
(بیت الحمد، شاہین نگر، حیدرآباد)

۳؍ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ
۱۱؍دسمبر ۲۰۱۸ء

• • •

الحاد ومادیت کا فتنہ اور علماء کی ذمہ داری

(کلیدی خطبہ اٹھائیسواں فقہی سیمینار، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

خالد سیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد :

صدر عالی قدر، ملک کے کونہ کونہ سے آئے ہوئے علماء وارباب افتاء، بیرونِ ملک سے آئے ہوئے معزز مہمانانِ گرامی قدر اور برادرانِ اسلام!

نومبر ۱۹۸۹ء میں دہلی میں اسلامک فقہ اکیڈمی کا پہلا سیمینار منعقد ہوا تھا، اسی وقت سے فکر ونظر کا یہ قافلہ رواں دواں ہے اور مختلف شہروں سے گزرتے ہوئے پھر دل والوں کی نگری، دہلی، کے قریب پہنچ گیا ہے اور آج ہندوستان کے ایک تاریخی خطہ میوات میں خیمہ زن ہے، اللہ کی ذات سے اُمید ہے کہ آئندہ بھی اس کا سفر اپنی منزل کی طرف اسی طرح رواں دواں رہے گا، وما ذالک علی اللہ بعزیز.

اس درمیان اکیڈمی کے ستائیس سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، ان سیمیناروں میں ۱۳۰ر مسائل زیر بحث آئے ہیں اور ان مسائل کے ذیل میں ۸۴۷ر تجاویز منظور کی گئی ہیں، اس وقت عالم اسلام کے بشمول دنیا میں جتنی فقہ اکیڈمیاں قائم ہیں، ان کے مقابلہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے سیمینار کی تعداد نمایاں طور پر زیادہ ہے، اور جو مسائل زیر بحث آئے ہیں اور فیصلے کئے گئے ہیں، ان کی تعداد تو اور بھی زیادہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل خاص اور اکیڈمی کے بانی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے جذبۂ اخلاص کا اثر ہے، اکیڈمی کے ان سیمیناروں میں جو مقالات پیش کئے گئے ہیں، ان کی مجموعی تعداد تقریباً پانچ ہزار ہے اور مقالات کے جو مجموعے طبع ہو چکے ہیں، ان کی تعداد ۱۳۰ر سے تجاوز کر چکی ہے، نیز اکیڈمی کی مطبوعات کی مجموعی تعداد ۲۴۰ سے زیادہ ہے۔

اکیڈمی فقہی سیمیناروں کے علاوہ فکری موضوعات پر اسلامی نقطۂ نظر کی رہنمائی کے لئے علماء اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے پروگرام منعقد کرتی ہے، اب تک اس طرح کے ۸۳ر پروگرام منعقد ہو چکے ہیں، اکیڈمی کا ایک اہم

مقصد دینی اور عصری تعلیم یافتہ فضلاء کی کثیر الجہات تربیت بھی ہے اور اس نے شروع سے اس پر توجہ دی ہے؛ چنانچہ اب تک اس نسبت سے ۳۳ر تربیتی پروگرام منعقد ہو چکے ہیں، تربیت ہی کے لئے اکیڈمی کی جانب سے دینی جامعات میں عصری موضوعات پر اور عصری جامعات میں دینی موضوعات پر توسیعی خطبات بھی رکھے جاتے ہیں؛ چنانچہ اب تک ۴۰ر خطبات کا اہتمام کیا گیا ہے، اکیڈمی کے سیمیناروں اور دوسرے پروگراموں میں بحمد اللہ عالم اسلام اور بیرونِ ہند کی اہم شخصیتوں کی شرکت ہوتی رہی ہے؛ حالاں کہ ویزا کی دشواریوں کی وجہ سے بہت سے اہل علم باوجود خواہش کے شریک نہیں ہو پاتے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود اب تک کے بیرونی شرکاء کی تعداد ساٹھ (۶۰) ہے۔

اکیڈمی کا ایک بڑا کارنامہ اور اُردو دنیا کے لئے اس کی سوغات ''الموسوعۃ الفقہیہ'' کا اُردو ترجمہ ہے، اب اس وقت ایک اہم کتاب ''المفصل فی احکام المرأۃ'' کا ترجمہ جاری ہے، ڈاکٹر وہبہ زحیلیؒ کی ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' کا اُردو ترجمہ بھی زیر تجویز ہے، اور ''موسوعۃ فقہاء الہند'' کے نام سے فقہاء ہند کے تذکرہ وحالات پر اُردو اور عربی میں ایک دستاویزی کتاب کی ترتیب کا کام چل رہا ہے، اکیڈمی کو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی متعنا اللہ بطول حیاتہ کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے اور وہ اِس وقت محدث جلیل حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی دامت برکاتہم کی قیادت میں اپنا سفر طے کررہی ہے، نیز اسے ملک کے مایۂ ناز علماء وفقہاء کی خدمات حاصل ہیں۔

حضرات ! افسوس کہ اس سال بہت سی اہم شخصیتیں ہم سے رُخصت ہوگئیں، دنیائے حدیث کے گوہر آبدار حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ کی وفات ہوئی ، ہندوستان کی ایک مایۂ ناز ہستی حضرت مولانا عبد اللہ کاپودرویؒ راہی آخرت ہوئے ، جو اکیڈمی سے بڑی محبت رکھتے تھے اور اس کے سیمیناروں میں شرکت فرماتے تھے؛ لیکن اکیڈمی کا ایک ذاتی نقصان یہ ہوا کہ ہم سب کے مخدوم ومربی اور گلشن قاسمی کے گل سر سبد حضرت مولانا محمد سالم قاسمی نور اللہ مرقدہ ہم سے رُخصت ہوگئے ، وہ اکیڈمی کے سرپرست اور ہم سب کے مشفق ومربی تھے، ان کے مشورے ہمارے لئے مشعل راہ ہوتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی ہمارے قدم کو مضبوط کرتی تھی، وہ اپنے معاصر علماء میں کئی خصوصیات کے اعتبار سے فرد فرید تھے، خاص کر فکری اعتدال اور اتحاد اُمت کی تڑپ اور اس کے لئے جذبۂ ایثار ان کے نمایاں اوصاف تھے، ان کی وفات اکیڈمی کے لئے بہت بڑا نقصان ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی فکرِ اعتدال پر ہم سب کو قائم رکھے۔

حضرات علماء کرام ! علماء انبیاء کے وارث ہیں، اس لئے انبیاء سے جتنی ذمہ داریاں متعلق تھیں، سلسلہ نبوت کے تمام ہونے کے بعد یہ ساری ذمہ داریاں علماء اُمت کے کاندھوں پر آ گئی ہیں، ان ذمہ داریوں میں ایک اہم ذمہ داری مجادلہ حسنہ ہے، یعنی بہتر طور پر دلیل وبرہان کے ساتھ اسلام کا دفاع۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ'' (النحل:۱۲۵) اس آیت میں دیکھئے، قرآن مجید میں موعظت کے لئے ''حسنہ'' کی صفت استعمال کی گئی؛ لیکن مجادلہ کے لئے اسم تفضیل کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ'' موعظت میں دل سے خطاب ہوتا ہے اور ناصحانہ اُسلوب کافی ہوجاتا ہے، اور مجادلہ میں دماغ سے خطاب ہوتا ہے اور دلائل وبراہین کی ضرورت پیش آتی ہے، موعظت حسنہ، غافلین کے لئے کافی ہوجاتی، یعنی ان لوگوں کے لئے جو ناواقفیت، لاعلمی اور غور وفکر نہ کرنے کی وجہ سے راہ راست سے منحرف ہوگئے ہوں، اور 'جدال احسن' ان لوگوں کے لئے ہے، جو انکار وجحود میں مبتلا ہوں، بعض دفعہ یہ انکار لوگوں کی زبان پر آجاتا ہے، اور بعض دفعہ ماحول، روایت اور خاندانی پس منظر وغیرہ کی وجہ سے زبان تو خاموش رہتی ہے؛ لیکن دل اس کا مریض ہوتا ہے اور اس میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھتے رہتے ہیں، اگر کبھی ایسے ماحول میں انسان پہنچ جائے، جس میں کوئی ٹوکنے اور روکنے والی زبان موجود نہ ہو تو دل کا خیال زبان پر آجاتا ہے، یہ فکری ارتداد کا فتنہ ہے، جو تیزی سے مسلمانوں کی نئی نسل اور اپنے آپ کو دانشور خیال کرنے والے طبقہ میں درآرہا ہے۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ یورپ میں طویل عرصہ جو تقریباً تین صدیوں پر محیط تھا، ایسا گزرا کہ کلیسا نے زندگی کے تمام شعبوں کو اپنے پنجۂ استبداد میں لے لیا تھا، شاہانِ مملکت بھی پوپ کے سامنے دم بخود رہتے تھے، پوپ نے تصور دیا تھا کہ وہ زمین پر خدا کا نائب ہے اور اس کا ہر قول وفعل اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، اسی من گھڑت عقیدہ کے تحت مغفرت نامے فروخت کرنے کا سلسلہ شروع ہوا، پوپ مرنے والوں کے لئے نہ صرف مغفرت نامہ لکھ کر دیا کرتا تھا؛ بلکہ جنت میں ان کی جگہ بھی متعین کرتا تھا اور یہ تعیین پوپ کو پیش کئے جانے والے نذرانوں کے لحاظ سے ہوتی تھی، آخر اس استحصال کے خلاف جرمنی کے ایک پادری مارٹن لوتھر Martin Luther (1483-1546) نے علم بغاوت بلند کیا؛ چوں کہ پورا یورپ پوپ کے ظلم سے عاجز تھا؛ اس لئے یورپ کے مختلف ملکوں میں اس کے مؤیدین اُٹھ کھڑے ہوئے، اس تحریک نے یہ نعرہ دیا کہ بندے اور خالق کا تعلق بلا واسطہ ہونا چاہئے، اس میں پوپ کے واسطہ کی ضرورت نہیں، پوپ کے مظالم کے جہاں حکومت اور عوام شکار تھے، وہیں اہل علم بھی اس سے دوچار تھے، کلیسا کی طرف سے اپنے مخالفین کو نہایت سخت سزائیں دی جاتی تھیں، اٹلی کے فلسفی اور سائنسداں برونو Bruno (1548-1600) کو زندہ جلا دیا گیا، مشہور ماہر فلکیات گلیلیو Galileo (1564-1642) کو تین سال قید خانہ میں بند رکھا گیا، جہاں اس سے توبہ نامہ کا ورد کرایا جاتا رہا۔

عیسائی علماء کو اپنے غیر سائنسی اور غیر منطقی افکار پر اس درجہ اصرار تھا کہ اس کے خلاف کچھ کہنا یا لکھنا ناقابل

برداشت جرم تھا؛ چوں کہ حضرت عیسیٰ زمین پر پیدا ہوئے اوران کے عقیدہ کے مطابق زمین پر بطور کفارہ ان کے پھانسی دیئے جانے کا واقعہ پیش آیا؛ اس لئے وہ کرۂ ارضی کو کائنات کا مرکز مانتے تھے،جس کے گرد سورج کے بشمول تمام سیارے گردش کرتے تھے، جب بعض سائنسدانوں نے اپنی تحقیق پیش کی کہ زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے،تو عیسائی مذہبی رہنماؤں نے اسے مذہب کے خلاف سمجھا اور جن سائنسدانوں نے اس طرح کی بات کہی ،انھیں سخت سزائیں دی گئیں ، وہ اس بات کو بھی بد دینی سمجھتے تھے کہ زمین کو گول قرار دیا جائے اور کہا جائے کہ اس کے دونوں جانب انسان بستے ہیں،ان کا خیال تھا کہ اگر ایسا ہوتا تو عیسیٰ مسیح دوسری طرف بھی جاتے اور دوبارانسان کے لئے مصائب برداشت کرتے''سینٹ آگسٹائن''(Saint Augustine) جیسا مذہبی رہنما بھی اس کا قائل تھا،کلیسا کا ایک بااختیارعہدیدار''ریگن'' کہا کرتا تھا کہ نچلی فضا کے بادلوں میں عفریت چھپے رہتے ہیں ، یہی قہراور بیماریاں لاتے ہیں ؛ چنانچہ عیسائی خانقاہیں اس کا علاج کرتیں ، چیچک اور ہیضہ وغیرہ کو خدا کی طرف سے نازل ہونے والاقہر قرار دیا جاتا تھااور اس کے علاج کو گناہ سمجھا جاتا تھا؛ کیوں کہ یہ خدا کومزید ناراض کرنے کے مترادف ہے؛اس لئے وہ بیماریوں کے ٹیکہ لگانے کے سخت مخالف تھے، چیچک کے ٹیکہ کے موجد''ڈاکٹر بوائلسٹن'' کی اتنی مخالفت کی گئی کہ جس شخص نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی اس کے گھر پر جلتا ہوا آگ کا گولہ پھینک دیا گیا،ازمنۂ وسطیٰ کے عیسائیوں اور پادریوں کواس بات پر شدید اصرار تھا کہ شہاب ثاقب کا گرنا قدرتی اورطبعی اسباب کا نتیجہ نہیں ہے،اس کو خدا بدکردار دنیا کی طرف پھینکتا ہے،دسمبر ۱۴۸۴ء میں''انوسینٹ''(Pope Innocent V111) نے حکم جاری کیا کہ جادو ہی انگور کے کھیتوں ، باغوں ، چراگاہوں اور فصلوں کی تباہی کا نتیجہ ہے؛اس لئے کلیسا کے فرمان پر ہزاروں عورتیں قید کرلی گئیں اور انھیں ایسی تکلیفیں پہنچائی گئیں کہ ان کے متعلقین عرض گذار ہوئے کہ ان کو موت کی سزا دے دی جائے ؛ تاکہ وہ اس اذیت اورتذلیل سے تو چھٹکارا پاجائیں ،اس طرح کے حالات تھے،جن کی وجہ سے مغرب میں عیسائیت کے خلاف بغاوت کا طوفان اُٹھا اوراس نے کلیسا کے قصر اقتدار کوزمین بوس کر کے رکھ دیا۔

اگر بات یہیں تک رہتی کہ یہ تحریک کلیسا کے نامعقول عقائد اور جبر وظلم کے ذریعہ اس کومنوانے کی کوشش کے خلاف ہوتی تو یہ بات خلاف انصاف نہیں ہوتی ؛لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا؛ بلکہ یہ تحریک عیسائیت سے آگے بڑھ کر مذہب کے خلاف ہوگئی ؛ حالاں کہ اسلامی تاریخ کے اُس دور میں بھی جب مسلمان علوم وفنون کی امامت کررہے تھے،اوراُس دور میں بھی جب اپنی تن آسانی کی وجہ سے وہ اس علمی مقام سے محروم ہوگئے تھے،انھوں نے نہ کبھی سائنسی تحقیق کی مخالفت کی ، نہ سائنسدانوں پر جبر وظلم کیا اور نہ نامعقول وخود تراشیدہ افکار کو بزور قوت منوانے کی کوشش کی ؛لیکن جب اس تحریک نے مذہب مخالف رُخ اختیار کیا،تو اب اس نے ان افکار کو بھی نشانہ بنایا،جن پر

اسلام کے بشمول تمام آسمانی مذاہب کا یقین رہا ہے، جیسے اسحاق نیوٹن Isac Newton (1642-1727) نے دعویٰ کیا کہ کائنات خود بخود وجود میں آئی ہے اور طبعی قوانین کے تحت چل رہی ہے، اس دعویٰ نے خدا کے وجود کے یقین کو ذہنوں میں متزلزل کردیا؛ کیوں کہ خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے اور اسی دلیل کو قرآن مجید نے بھی بار بار پیش کیا ہے کہ کسی خالق اور صانع کے بغیر کائنات وجود میں نہیں آسکتی اور وہی خالق وصانع خدا کی ذات ہے۔

قیامت کا عقیدہ اس اساس پر قائم ہے کہ مادہ بھی فانی ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ پوری کائنات فنا ہوجائے گی اور عالم آخرت شروع ہوجائے گا؛ لیکن فرانس کے ایک سائنسداں (لوائے زر) "Lavoisier" نے دعویٰ کیا کہ مادہ غیر فانی ہے، یہ اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے، مگر فنا نہیں ہوتا، پھر یہی بات ''ٹائٹ'' P.G Tait 1876 (امریکہ) نے کہی کہ کائنات کی حقیقت صرف مادہ ہے اور انسان مادہ کو نہ فنا کرسکتا ہے اور نہ پیدا کرسکتا ہے، اسی کو بعد میں جرمنی کے مشہور مفکر ہیگل Hegal(1770-1830) (جرمنی) نے تقویت پہنچائی اور کہا کہ عالم غیب کوئی چیز نہیں ہے، جو اس کائنات میں موجود ہے، بس وہی موجود ہے، نیوٹن نے اس بات سے انکار کیا تھا کہ کائنات کے وجود میں آنے کے لئے خدا ضروری ہے، ''ڈارون'' Darwin 1809-1882 نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا کہ خود انسان کی تخلیق بھی کسی خالق کے بغیر ہوئی ہے کہ طبعی قوانین کے تحت دنیا میں حیات نمودار ہوئی، اس نے یک خلیہ جرثومہ سے ترقی کرتے کرتے انسان کی شکل اختیار کی، گویا خدا کا وجود اور قیامت کا تصور ان دونوں کو ماننے کی ضرورت نہیں رہی۔

رہی سہی کسر ''فرائڈ'' نے پوری کردی کہ انسان ایک جنس پرست حیوان ہے، اور یہی جنسی جذبہ زندگی کا خلاصہ ہے، یہاں تک کہ بچے کا ماں کے سینے سے دُودھ پینا اور انگوٹھا چوسنا بھی جذبہ جنسی کا مظہر ہے، جہاں ''ڈارون'' اور ''نیوٹن'' نے خدا کے تصور پر حملہ کیا تھا، وہیں ''فرائڈ'' نے مذہبی اخلاقیات کو تار تار کرکے رکھ دیا، اور انسان کو منبع شہوت قرار دے دیا، مذہب کی بنیاد، وحی اور مابعد الطبعی علم پر ہے؛ اسی لئے آسمانی اور غیر آسمانی جتنے مذاہب ہیں، ان کے پاس مذہبی صحائف رہے ہیں، جو ان کے خیال کے مطابق خدائی ہدایت نامہ ہے، اسی لئے متکلمین اسلام نے حواس، اور عقل کے ساتھ ساتھ خبر صادق کو بھی علم کا ایک ذریعہ مانا ہے، مگر فرانس کے مشہور فلسفی اور سائنسداں ''ڈی کارٹ'' Descartes(1597-1650) (فرانس) نے تصور پیش کیا کہ صرف عقل وحواس ہی علم کا ذریعہ ہیں اور کوئی علم کا ذریعہ نہیں ہے، گویا اس طرح وحی کے انکار کا راستہ فراہم کردیا گیا۔

خدا کے وجود کی ایک اہم دلیل اس کی رزاقیت ہے، اٹھارہویں صدی میں مالتھس Malthus (1766-1834) (انگلستان) پیدا ہوا اور اس نے دعویٰ کیا کہ بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کی وجہ سے وسائل

رزق ناکافی ہوجائیں گے اوراسی نے تحدید نسل کی تجویز پیش کی ،جس کا جادو آج پوری دنیا میں سر چڑھ کر بول رہا ہے ؛لیکن مالتھس کی اس پیشین گوئی پر دوسو سال گزرنے کو ہے اور دنیا کی آبادی اس وقت کے مقابلہ میں تقریباًدس گنا بڑھ گئی ہے؛لیکن اس کی نوبت نہیں آئی کہ کائنات میں وسائل رزق کا دامن تنگ ہونے کی وجہ سے انسان کے مرنے کی نوبت آجائے ،گویا یہ بالواسطہ اللہ تعالیٰ کی رزاقیت کا انکار ہے۔

ان تصورات کا اثر یہ ہوا کہ یا تو سرے سے مذہب ہی کا انکار کردیا گیا،جیسا کہ ''کارل مارکس''Karlmarx (1818-1883)(جرمنی)نے مذہب کو افیون قرار دے دیا؛لیکن جو چیز سماج میں ہزاروں سال سے رچی بسی ہو،اس کو بالکل نکال پھینکنا آسان نہیں ہوتا؛اس لئے ایک دوسرا گروہ پیدا ہوا،جس نے مذہب کا کلیۃً انکار کرنے بجائے اس کی عمل داری کو محدود کردیا؛چنانچہ فرانس کے ''فری میسن لاج''Free Mason Lage(1766)نے پہلی بار لادینی طرز حیات کا تصور پیش کیا اور انقلاب فرانس (1789ء) کے بعد فرانس کے لوگوں نے اپنے لئے اسی لادینی جمہوریت کا انتخاب کرلیا، پھرآہستہ آہستہ یہ پورے مغرب کا سب سے مقبول نظریہ ہوگیا،اس نظریہ میں مذہب کو فرد کی ذاتی زندگی تک محدود کردیا گیا،اور زندگی کے تمام شعبوں سے مذہب کو نکال باہر کیا گیا؛چنانچہ بعض مغربی ممالک اس شدت کے ساتھ اس کے قائل اور اس پر عمل پیرا ہیں کہ وہاں مذہبی علامتوں کے استعمال کو بھی جرم قرار دے دیا گیا ہے،جیسے حجاب اور برقعہ وغیرہ۔

جب مغربی استعماریت مشرق کی طرف بڑھی ،مسلم حکومتیں کمزور پڑ گئیں اور مغرب نے ان کو روند ڈالا تو لادینیت کا جوزہر وہ اپنے ساتھ لائے تھے،انھوں نے یہاں بھی اس کے انجکشن لگانے شروع کئے اور یہ حقیقت ہے کہ مغرب کے نظریۂ لادینیت اور پھر مشرق کے بڑے خطے پر کمیونزم کے اقتدار نے مسلمانوں کے ایک طبقہ کو اس سے بہت زیادہ متاثر کیا،شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ عالم عرب میں مصر اور عالم عجم میں برصغیر اس فکر کی تبلیغ کا مرکز بن گیا، دیگر اہل مذاہب نے تو فوراًہی انکار مذہب کی اس تحریک کے سامنے ہتھیار ڈال دیا؛ کیوں کہ مذہب کے نام پر چند عباداتی رسوم کے سوا کوئی اور چیز ان کے یہاں موجود نہیں تھی ، یا اگر تھی تو وہ انسانی آمیزشوں میں اپنے وجود کو گم کرچکی تھی ،اور اس میں ایسی نامعقول باتیں شامل ہوگئی تھیں ،جن میں حقائق کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی ؛ اس لئے انھوں نے فوراًہی ہتھیار ڈال دیا اور صرف فرد کی نجی زندگی میں مذہب پر عمل کرنے کی گنجائش باقی رہ جائے،اسی کو اپنے لئے کافی سمجھا ؛چنانچہ آج مسلمانوں اور کسی قدر یہودیوں کے سوا کم وبیش تمام قوموں کی یہی صورتحال ہے،خود ہمارے ملک میں راسخ العقیدہ برادرانِ وطن یہ تو کہتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا کو ختم کردیا جائے ؛لیکن کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہے کہ ''منوسمرتی'' پر مبنی حقیقی ہندو قانون کو لایا جائے ؛اس لئے کہ اس کو وہ بھی ناقابل عمل اور فرسودہ سمجھتے ہیں۔

اب چوں کہ لادینیت کے فلسفہ کے مقابلہ میں صرف اسلام ہے؛ اس لئے ان کی طرف سے سارے حملے اسلام پر کئے جاتے ہیں، اسلام چوں کہ خالق کائنات کا بھیجا ہوا دین ہے؛ اس لئے وہ کائنات کی فطرت، عقل اور انسانی ضرورت ومصلحت سے صد فیصد ہم آہنگ ہے؛ اس لئے عمومی طور پر مسلمانوں پر یہ جادو نہیں چل پاتا ہے، آج بھی اُمتِ مسلمہ کی غالب ترین اکثریت اسلام پر بھرپور یقین رکھتی ہے، اور ایمان کی جڑیں ان کے دل ودماغ کی گہرائیوں میں پیوست ہیں؛ اس لئے جیسے مغرب ومشرق کی دوسری قوموں نے اس فلسفہ کو قبول کرلیا، مسلمانوں کو فتح کرنے میں انھیں کامیابی حاصل نہیں ہوسکی؛ اس لئے مغرب نے مسلمانوں میں سے دو طبقوں کو اپنا آلہ کار بنانے کی کوشش کی اور اعتراف کرنا چاہئے کہ انھیں اس میں ایک حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی، ایک: مغرب نواز فرمانرواؤں کو مسلم ملکوں پر مسلط کرنا، جنھیں عوامی انتخاب کے ذریعہ نہیں؛ بلکہ فوجی انقلاب کے ذریعہ تختِ اقتدار پر پہنچایا جائے، اور ان سے جبر وتشدد کے ذریعہ مغربی نظامِ حیات کو نافذ کرایا جائے، اسلام کے قانونِ تعزیرات، قانونِ مالیات، سیاسی نظام اور تعلیمی نظام کو توختم کر ہی دیا جائے، ساتھ ساتھ عائلی زندگی کا تعلق چوں کہ فرد کی نجی زندگی سے ہوتا ہے؛ اس لئے اس میں احتیاط کے ساتھ اور تدریجی طور پر کاٹ چھانٹ کی جائے، مغرب کی اس ریشہ دوانی سے شاید ہی کوئی مسلم ملک محفوظ ہو، یہاں تک کہ ''حرمِ مامون'' میں بھی اب اسلام کے پورے نظامِ حیات کو امان حاصل نہیں ہے۔

دوسرے: مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک ایسا گروہ پیدا کیا جائے، جس کے نام تو مسلمانوں کے سے ہوں، جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں اور جو مسلمانوں کی بہت سی سماجی تہذیبی روایت کو اپنائے ہوئے ہوں؛ لیکن حقیقی معنوں میں اسلام پر ان کا یقین نہیں ہو، وہ حدیث کا انکار کرتے ہوں، جو چیز مغربی مفکرین کے نزدیک ناقابلِ قبول ہو اور قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا ہو، اس کی دُور از کار تاویل کرتے ہوں، شریعت کے جن احکام کو مغرب کی طرف سے خلافِ عقل قرار دیا جاتا ہے، ان کو عارضی اور وقتی عمل قرار دے کر ان سے دامن بچاتے ہوں، وہ اسلام کا ایک ایسا ایڈیشن تیار کرنے کی کوشش کریں، جس میں مغرب کے جذبۂ لذت اندوزی اور شہوت پرستی میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے، یہ کام قریب قریب ایک ہی زمانہ میں مصر اور ہندوستان میں شروع ہوا، علماء ربانیین کی کوششوں اور اسلام کی اپنی طاقت کی وجہ سے عوامی سطح پر انھیں اس سلسلہ میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی اور مستشرقین کی طرف سے بھی غذا فراہم کرنے کے باوجود وہ اس میں ناکام ہی رہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی ناکام ہی رہیں گے، واللہ متمّ نورہ و لو کرہ الکافرون۔

لیکن انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی کے اس دور میں ایک نئی صورتحال پیدا ہوگئی ہے اور وہ یہ کہ جو جھوٹ

اور جعلسازی کتابوں کے دفینوں میں پڑی رہتی تھی، اب میڈیا اور بالخصوص الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اس کو لمحوں میں ہر کچے پکے مکان میں پہنچا دیا جاتا ہے، اور میڈیا اس فلسفہ پر عمل کرتا ہے کہ جھوٹ کو اتنا دوہراؤ کہ وہ سچ ہوجائے، بدقسمتی سے نہ مسلمانوں کے پاس اپنا میڈیا ہے، اور نہ نیشنل اور انٹرنیشنل میڈیا ان کی آواز لوگوں تک پہنچاتا ہے؛ اس لئے جدید تعلیم یافتہ لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک حلقہ میں شکوک وشبہات کے کانٹے بوئے جارہے ہیں، جیسے کمیونسٹ روس کے عہد ترقی میں مسلمانوں میں ایک اچھا خاصا دین بیزار گروہ پیدا ہوگیا تھا اور اپنے آپ کو ترقی پسند قرار دیتا تھا، اسی طرح اب پھر ایسا گروہ اُبھر رہا ہے، جس نے اسلام بیزاری کا راستہ اختیار کیا ہے، حدیث کا انکار، قرآن مجید کی تشریح وتوضیح میں دُور از کار معنی آفرینی، قانون شریعت پر اعتراض، اسلامی شعائر کا تمسخر، داڑھی کا استہزاء، غیر مسلموں کے ساتھ نکاح کے بڑھتے ہوئے واقعات، مسلم سماج میں بڑھتی ہوئی بے حجابی، مخلوط تعلیم کی طرف رجحان، خاندانی زندگی کی قید سے آزادی اور خاندان کا بکھراؤ، ہمسایہ قوموں کے مذہبی تہواروں میں شرکت اور اس کو انسانیت دوستی کا نام دینا، مسلمانوں کے زیر انتظام عصری تعلیمی اداروں میں مخلوط کلچرل پروگرام اور غیر اسلامی یونیفارم اور اس کے باوجود مسلمانوں کی طرف سے اس کی پذیرائی وغیرہ وہ باتیں ہیں، جو ایک سیلاب بلاخیز کی طرح آگے بڑھ رہی ہیں، یہ ایک تہذیبی اور فکری ارتداد ہے، یہ ایسا ارتداد ہے جو دبے پاؤں آتا ہے اور ایک سست رفتار زہر کی طرح کسی قوم کے پورے وجود میں پھیل جاتا ہے۔

اس وقت اس فتنہ کا مقابلہ علماء کی ایک بڑی ذمہ داری ہے اور اس کے لئے دو باتیں ضروری ہیں: ایک یہ کہ علماء منبر ومحراب سے عام اصلاحی باتوں کے ساتھ ساتھ فکری پہلو پر بھی خطاب کریں، جمعہ کے خطابات، سیرت اور اصلاح معاشرہ کے جلسوں اور تعلیم یافتہ دانشوروں اور عصری درسگاہوں کے طلبہ وطالبات کے درمیان پروگراموں کے ذریعہ اسلام کی حقانیت اور آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی کامیابی کے لئے اسلامی تعلیمات کی ضرورت واہمیت کو دلائل کے ذریعے سمجھایا جائے، دل سے بھی خطاب ہو اور دماغ سے بھی، جیسا کہ اس وقت مسلم پرسنل لا سے متعلق چند مسائل پر تفہیم شریعت کے پروگرام رکھے جاتے ہیں اور بحمد اللہ اس کے بہتر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

دوسرا اہم کام جو اسی سے متعلق ہے، یہ ہے کہ جیسے ہم علم کلام کو پڑھتے ہیں اور ایمانیات کی تفصیلات سے واقف ہوتے ہیں، اسی طرح ہم اسلامی معتقدات کی عقلی بنیادوں کو بھی جاننے کی کوشش کریں؛ کیوں کہ انسانی عقل ہر بات کا ادراک کرلے یہ ضروری نہیں؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خدا کا کوئی حکم عقل کے خلاف نہیں ہوسکتا، سلف صالحین اور خاص کر ماضی قریب کے علماء میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے یہاں اس کی بہترین مثالیں ملتی ہیں، انھوں نے کتنی قوت کے ساتھ اور آفاق وانفس کی دلیلوں سے ایمانیات کو ثابت کرنے کی

کوشش کی ہے؛ اسی طرح جیسے ہم فقہ کو پڑھتے ہیں، ہم احکام شریعت کے ساتھ ساتھ شریعت کے اسرار و مقاصد کا بھی مطالعہ کریں، اسی طرح آج اعدائے اسلام، اسلام پر جو سوالات اُٹھاتے ہیں، ہمیں ان سے بھی واقف ہونا چاہئے اور علمی وفکری اعتبار سے اس کے رد کے لئے تیار رہنا چاہئے، کسی فوج کے فتح مند ہونے کے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے ہتھیار سے واقف ہو؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ہتھیار سے بھی آگاہ ہو۔

فکری اعتبار سے عیسائیت، ہندومت یا دیگر ادیان باطلہ کا مقابلہ دشوار نہیں ہے؛ کیوں کہ ان کے پاس نہ کوئی دلیل ہے نہ عقل وخرد کے شواہد اور نہ عقلائے روزگار کی تائید؛ لیکن لادینیت کے پیچھے ان مغربی مفکرین کی قوتیں ہیں، جن کو کھوٹے ہونے کے باوجود سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، ضرورت ہے کہ علماء اس پہلو سے اسلام کا مطالعہ کریں، آج کے مسلمہ طرز استدلال کے مطابق اسلام کو پیش کریں، اس موضوع پر لکھیں، اس کو اپنی علمی کاوشوں کا موضوع بنائیں اور اس طرح کے مضامین کو دینی جامعات کے نصاب میں شامل کریں؛ ورنہ اس فتنہ کا اثر بہت خراب ہوگا اور خدانخواستہ وسط ایشیاء اور مشرقی یورپ کے بعض مسلم گروہوں کا سا حال ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ اس فتنہ سے اُمت کی حفاظت فرمائے اور علماء اُمت کو پوری فکرمندی اور ذہانت کے ساتھ اس سے نبرد آزما ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرات ! اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ اٹھائیسواں فقہی سیمینار جے پور میں منعقد ہونے والا تھا، جہاں اکیڈمی کا نواں سیمینار ۱۹۹۶ء میں منعقد ہوچکا ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی ہوگا، اس وقت بعض مقامی مجبوریوں کے تحت نظام میں تبدیلی کرنی پڑی اور اصل میں اللہ کو یہ بات منظور تھی کہ یہ میوات کی اس سرزمین میں منعقد ہو، جہاں بسنے والی میو قوم نے اپنی بہادری، شجاعت اور جفاکشی کی صلاحیت کے باوجود اپنی مرضی سے بحیثیت قوم اسلام قبول کیا اور چھٹی صدی ہجری میں اس قوم نے —— جسے انسانوں کی غلامی کا طوق نہیں پہنایا جاسکتا تھا —— اپنی مرضی سے اپنے گلے میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی غلامی کا طوق ڈال لیا، ہزار آزادیاں اور صد ہزار بادشاہتیں اس غلامی پر قربان، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بقول عرب جاہلیت کی بہت سی خصوصیات اس قوم میں موجود تھیں، جن میں ضیافت و مہمان نوازی اور تصلب و وفا شعاری کا وصف بھی ہے؛ چنانچہ اسی گروہ نے حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ذریعہ اُٹھنے والی تحریک دعوت وتبلیغ کا پرجوش استقبال کیا اور اس قافلہ کی کچھ اس طرح میزبانی کی اور اس سے وفاداری کا حق ادا کیا کہ وہ اس جدوجہد کے سابقین اولین قرار پائے۔

اگرچہ دعوت وتبلیغ کے کام کو یہاں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی؛ لیکن یہ اتنا بڑا علاقہ کسی قابل ذکر دینی درسگاہ سے خالی تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ (متوفی: ۱۷؍رجب ۱۴۳۳ھ، مطابق ۷؍جون ۲۰۱۲ء) کے

مقدر میں یہ بات لکھی تھی کہ ان کے ذریعہ اس علاقہ میں میراث نبوی کی تقسیم ہو اور یہاں سے علم کا سرچشمہ جاری ہو، انھوں نے ۱۹۶۵ء میں اس سدابہار پودے کو لگایا، جو آج جامعہ اسلامیہ دارالعلوم محمدیہ میل کھیڑلا کی شکل میں آپ کے سامنے ہے اور ایک شجر سایہ دار بن چکا ہے، نیز بحمد اللہ دُور دُور تک اس کا فیض پہنچ رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو ہمیشہ قائم اور روبہ ترقی رکھے، آمین۔

اکیڈمی اور اس کے ذمہ داران جامعہ ہذا اور اس کے عالی حوصلہ ارباب انتظام کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انھوں نے محبت کے ساتھ اس سیمینار کی میز بانی کی پیشکش کی اور جس محبت اور اہتمام کے ساتھ یہ حضرات اور اس علاقہ کے مسلمان اس کاروانِ فکر ونظر اور قافلہ علم وتحقیق کا استقبال کر رہے ہیں، وہ آپ کے سامنے ہے، اللہ تعالیٰ سیمینار کو قبول فرمائے اور ہمیں مفید اور بہتر فیصلوں کی توفیق عطا فرمائے۔

اللّٰهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه، وبالله التوفيق وهو المستعان.

● ● ●

تعزیر بالمال — شریعت اسلامی کی روشنی میں

مفتی شاہد علی قاسمی ☆

اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان جیسے ملک میں جرم کرنے والے کو سزا دینا ایک مشکل مرحلہ ہے، اگر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے تو فیصلہ آنے تک لمبی مدت گذر جاتی ہے اور سماجی طور پر معاملہ حل کیا جائے اور محسوس ہو کہ مجرم کی جسمانی سرزنش کی جائے تو یہ بھی مشکل ہے کہ یہ قانونِ ملکی کے خلاف ہے، ان حالات میں تعزیز مالی اہم رول ادا کرسکتی ہے، اس پس منظر میں تعزیر مالی سے متعلق سوالات کو زیر بحث لانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

تعزیر بالمال اور تعزیر باخذ المال کا فرق

تعزیز بالمال سے مراد مالی تاوان اور مالی سزا ہے، یعنی مجرم سے جرمانہ کے طور پر اس کا مال لیا جائے اور واپس نہ کیا جائے اور تعزیر باخذ المال سے مراد بعض فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ مجرم سے بہ طور جرمانہ عارضی اور وقتی طور پر مال لیا جائے، جب محسوس ہو کہ مجرم میں صلاح پیدا ہوگیا ہے، اپنے جرم سے تائب ہو چکا ہے تو اب اسے مال لوٹا دیا جائے، جیسا کہ صاحب فتاوی بزازیہ فرماتے ہیں :

معناه أن نأخذ ماله ونودعه ، فإذا تاب نرده عليه ۔ (۱)

تاہم تعزیز بالمال اور تعزیر بأخذ المال کا یہ فرق حتمی نہیں ہے، اصل میں تعزیر مالی کو امام ابو یوسفؒ نے جائز قرار دیا، جب کہ جمہور فقہاء نے ناجائز قرار دیا، تو امام ابو یوسفؒ کے جواز والے قول کی تاویل یوں کی گئی کہ مال بہ طور جرمانہ لے کر محفوظ کردیا جائے، گویا یہ تعزیر باخذ المال ہوئی، پھر مال بعد میں واپس کردیا جائے تو یہ مکمل تعزیر مالی بھی نہیں ہوئی، اس طرح جمہور فقہاء کی مکمل مخالفت بھی نہیں ہوئی ؛ چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ نے بھی امام ابو یوسفؒ کے قول جواز کی یوں تاویل کی :

إمساك شيئ من ماله عنه مدة لينزجر ، ثم يعيده الحاكم إليه ، لا أن يأخذ الحاكم لنفسه أو لبيت المال ۔ (۱)

☆ معتمد تعلیم: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۱) فتاوی بزازیہ علی ہامش الہندیہ: ۴۲۷/۶۔ (۲) البحر الرائق: ۴۱/۵۔

قابل غور بات یہ ہے کہ تعزیر باخذ المال کی یہ تشریح اس قول کے قائل امام ابو یوسفؒ سے خود مروی نہیں ہے؛ بلکہ بعض حنفی فقہاء نے ایسی تشریح کر کے ایک درمیانی راہ نکالی ہے؛ تا کہ جمہور فقہاء کے نقطۂ نظر سے ٹکراؤ نہ ہو؛ لیکن جب خود امام ابو یوسفؒ نے ایسی تشریح نہیں کی تو پھر تعزیر باخذ المال کی مذکورہ تعریف توجیہ القول بمالا یرضی بہ القائل کی قبیل سے معلوم ہوتا ہے؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ امام ابو یوسفؒ تعزیر مالی کے جواز کے قائل ہیں جو کہ فقہ حنفی کا ضعیف قول ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعزیر بالمال اور تعزیر باخذ المال ایک ہی حقیقت کا نام ہے، دونوں الگ الگ نہیں۔

تعزیر بالمال وتعزیر باخذ المال کا فرق ماننے کی صورت مسئلہ کے حکم پر اثر

اگر تعزیر بالمال اور تعزیر باخذ المال میں فرق نہ ہو تب تو ظاہر ہے کہ دونوں کا حکم یکساں ہوگا؛ لیکن اگر دونوں کے درمیان فرق تسلیم کیا جائے، جیسا کہ بعض فقہاء احناف نے ایسی توجیہ کی ہے، تو اس سے مسئلہ پر یہ اثر مرتب ہوگا کہ :

(۱) وقتی وعارضی مالی تعزیر کے جواز میں زیادہ تأمل کی نوبت نہیں آئے گی؛ کیوں کہ اس صورت میں دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر لینے اور استعمال کرنے کی ممانعت والی آیات واحادیث سے واضح ٹکراؤ نہیں ہوگا، گویا یہ صورت تعزیر مالی سے نکل کر حبس مال کے دائرہ میں آئے گا، اور وقتی طور پر حبس مال بڑی خرابی نہیں جو خرابی مکمل طور پر مال لینے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

(۲) تعزیر بالمال اور تعزیر باخذ المال کا یہ فرق ماننے کی صورت میں ایک اہم بات یہ بھی سامنے آئے گی کہ تعزیر مالی یعنی تعزیری طور پر مال لے لینے اور اس کی طرف مال کی ملکیت منتقل قرار دینے کا دروازہ بند ہو جائے گا، جب کہ ہندوستان جیسے ملک میں بہ وقت ضرورت تعزیر مالی کی راہ سے سزا دینے کا جواز رہنا چاہئے، جیسا کہ آئندہ سطور میں اس کی تفصیل آرہی ہے، اس لئے راقم الحروف کے نزدیک امام ابو یوسفؒ کے قول جواز کو تعزیر بالمال پر محمول کرنا چاہئے، یعنی تعزیر بالمال اور تعزیر باخذ المال کا فرق نہیں ہونا چاہئے، خصوصاً اس پس منظر میں کہ خود امام ابو یوسفؒ نے تعزیر باخذ المال کی ایسی تشریح نہیں کی ہے، گویا امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تعزیر مالی جائز ہے۔

تعزیر بالمال کی بابت حنفیہ کا مسلک

تعزیر مالی کی بابت حنفیہ کا معروف مسلک تو یقیناً عدم جواز کا ہے؛ چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں :

الحاصل : أن المذهب عدم التعزير بأخذ المال ۔ (۱)

(۱) البحر الرائق: ۵/ ۴۴۔

نیز علامہ شامی رقمطراز ہیں :

الحاصل : أن المذهب عدم التعزير بأخذ المال ۔ (۱)

تعزیر مالی کا جواز اور اس کی فقہی حیثیت

جیسا کہ مذکور ہوا کہ تعزیر مالی کا عدم جواز جمہور فقہاء کا مسلک ہے، تاہم امام ابو یوسفؒ سے جواز کا قول مروی ہے؛ لیکن اسے مذہب حنفی میں ضعیف قرار دیا گیا ہے، مشہور حنفی فقیہ علامہ شامیؒ رقمطراز ہیں :

عن أبي يوسف يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال وعندهما وباقي الأئمة لا يجوز ومثله في المعراج وظاهره أن ذلک رواية ضعيفة عن أبي يوسف ۔ (۲)

مذکورہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ تعزیر مالی کے جواز کا قول ضعیف ہے؛ اس لئے عام حالات میں اس قول پر فتوی نہیں دیا جاسکتا ہے، تاہم مجبوری اور سخت ضرورت درپیش ہو اور مالی جرمانہ کے بغیر مجرم پر شکنجہ کسنے کی راہ ہموار نہ ہو تو اولاً وقتی اور عارضی طور پر مالی جرمانہ عائد کیا جائے، یعنی بہ طور جرمانہ مال لے کر محفوظ کر دیا جائے اور جب صلاح ظاہر ہو تو اس کا مال اسے واپس کر دیا جائے؛ چنانچہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں :

مالی جرمانہ ناجائز ہے اور امام ابو یوسفؒ سے جو تعزیر بالمال کے جواز کی روایت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ مدت کے لئے اس کا مال روک لیا جائے اور جب انزجار کی اُمید ہو جائے تو اس کا مال واپس کر دیا جائے ۔ (۳)

حضرت امام ابو یوسفؒ جو بہ وقت ضرورت تعزیر مالی کی اجازت دیتے ہیں تو پھر بعد اصلاح اس کے واپس کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں اور یہ اباحت نفع بخش نہیں ۔ (۴)

اگر وقتی مالی جرمانہ سے کام نہ چل سکے اور بہ صورت مجرم کو جرم سے باز نہ رکھ سکے تو کیا مالی جرمانہ کی اجازت ہوگی؟ اس کا جواب عام طور پر اکابر کی تحریروں میں عدم جواز کا ہے؛ اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ اس سے بچا جائے، تاہم اگر سماج کے با اثر اور مصنف مزاج لوگ محسوس کرتے ہوں کہ مالی جرمانہ عائد کرنا حالات کے اعتبار سے ناگزیر ہے، تو مقامی قابل اعتماد علماء سے مشورہ کے بعد مالی جرمانہ عائد کرنا درست ہوگا، جیسا کہ ضرورت وحاجت کے وقت قول ضعیف کا سہارا لینے کی گنجائش ہوتی ہے؛ چنانچہ علامہ شامی عقود رسم المفتی میں فرماتے ہیں :

---

(۱) ردالمحتار: ۶۲/۴ ۔
(۲) ردالمحتار مع الدر: ۵۱/۴ ۔
(۳) کفایت المفتی: ۱۶۶/۲ ۔
(۴) منتخبات نظام الفتاوی: ۱۹۱/۲ ۔

ولا يجوز بالضعيف العمل ولا به يجاب من جاء يسئل
إلا لعامل له ضرورة أو من له معرفة مشهورة (۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مالی جرمانہ عائد کرنے کا جواز قول ضعیف پر مبنی ہے، عام حالات میں اسے اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے، تاہم اگر اس کے سوا چارہ نہ ہو تو مقامی معتبر علماء کے مشورہ سے اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

کیا فقہاء حنفیہ میں کسی کا فتوی تعزیر مالی کے جواز کا ہے؟

فقہاء حنفیہ میں جنھوں نے تعزیر مالی کو جائز قرار دیا ہے، ان میں ایک اہم نام قاضی علاء الدین طرابلسی کا ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں کہ عقوبت مالیہ کے منسوخ ہونے کی بات غلط ہے؛ کیوں کہ نسخ کی بات کسی دلیل پر مبنی نہیں ہے، الفاظ کچھ اس طرح ہیں :

يجوز التعزير بأخذ المال وهو مذهب أبي يوسف وبه قال مالك، ومن قال : إن العقوبة المالية منسوخة فقد غلط على المذاهب الأربعة نقلا واستدلالاً وليس بسهل دعوى نسخها۔ (۲)

اسی طرح صاحب خلاصۃ الفتاوی کا رجحان مالی تعزیر کے جواز کی طرف ہے، جیسا کہ تاتارخانیہ میں ہے :

وفي الخلاصة : التعزير بأخذ المال إن رأى القاضي والوالي جاز۔ (۳)

نیز علامہ کردری کی تحریر سے بھی جواز معلوم ہوتا ہے :

والتعزير بأخذ المال إن المصلحة فيه جائزة۔ (۴)

حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے بھی از راہ تنبیہ اس کی اجازت دی ہے، لکھتے ہیں: ''تنبیہ کے لئے جرمانہ لینا جائز ہے''۔(۵)

معاصر علماء میں حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب کا رجحان بھی جواز کی طرف ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

......لیکن اگر کوئی مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہوا ہے تو اس پر جس طرح جسمانی سزا عائد کی جا سکتی ہے اسی طرح مالی سزا بھی عائد کی جا سکتی ہے...... چنانچہ بعض متاخرین فقہاء حنفیہ نے امام ابو یوسفؒ کے قول کو راجح قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ تعزیر بالمال جائز ہے۔(۶)

---

(۱) عقود رسم المفتی۔
(۲) معین الحکام:۱:۱۹۵۔
(۳) الفتاوی التاتارخانیۃ:۶/۴۰۲۔
(۴) الفتاویٰ البزازیۃ علی ہامش الہندیہ:۶/۴۲۷۔
(۵) فتاوی مولانا عبدالحی، ص:۳۵۹۔
(۶) تقریر ترمذی:۲/۱۱۹۔

اسی طرح حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم نے تعزیر مالی پر مختصر مقالہ تحریر کرتے ہوئے اپنا رجحان جواز کا پیش فرمایا ہے، مختصراً اقتباس اس طرح ہے :

اس لئے اگر موجودہ زمانے میں اور بالخصوص ہندوستان کے خصوصی حالات میں اس کو قبول کرلیا جائے تو اُمید ہے کہ بہت سے منکرات کے سد باب میں اس سے مدد ملے گی اور اس سے فائدہ ہوگا۔(۱)

راقم الحروف کی نگاہ میں جب سرزنش کا مناسب دوسرا راستہ نہ ہو تو مالی سرزنش کے قول ضعیف سے مدد لینا درست ہے۔

مذاہب ثلاثہ میں مالی تعزیر کا حکم

مالکیہ : مسلک مالکی میں راجح قول تعزیر کے عدم جواز کا ہے؛ بلکہ حاشیہ دسوقی میں اسے اجماعی قول قرار دیا گیا ہے؛ چنانچہ لکھتے ہیں: ''ولا يجوز التعزير بأخذ المال إجماعًا''۔(۲)

شرح زرقانی میں ہے :

وفي شرح الآثار : التعزير بأخذ المال كان في ابتداء الإسلام ثم نسخ ، كذا في المجتبى ، وعندهما وباقي الأئمة الثلاثة ۔ (۳)

تاہم مشہور مالکی فقیہ ابن فرحون نے اس کا جواز نقل کیا ہے اور اس کی نسبت مالکی فقہاء کی طرف کی ہے :

والتعزير بالمال : قال به المالكية ۔ (۴)

بلکہ بعض حضرات نے صراحتاً اس کی نسبت امام مالکؒ کی طرف کی ہے: ''وبه قال مالك''۔(۵)

غالباً جواز کا قول مالکیہ کے یہاں مرجوح ہے، اسی لئے اکثر مالکی کتب میں اس کا عدم جواز مذکور ہے۔

شوافع : صاحب تحفۃ المحتاج نے صراحت کی ہے کہ امام شافعیؒ کے قول جدید کے مطابق تعزیر مالی جائز نہیں ہے؛ البتہ قول قدیم میں اجازت ہے :

ولا يجوز على الجديد بأخذ المال ۔ (۶)

اسی طرح کی بات امام نوویؒ ''المجموع: ۱۲۵/۲۰، اور صاحب نہایۃ المحتاج: ۲۲/۸'' وغیرہ نے ذکر کیا ہے، گویا تعزیر مالی کا عدم جواز راجح ہے اور قول جواز مرجوح ہے۔

(۱) اسلام اور جدید معاشرتی مسائل، ص: ۲۴۸۔ (۲) حاشیۃ الدسوقی: ۳۵۵/۴۔
(۳) شرح الزرقانی علی مختصر خلیل: ۲۰۱/۸۔ (۴) تبصرۃ الحکام: ۲۹۳/۲۔
(۵) فقہ السنۃ: ۵۹۲/۳۔ (۶) تحفۃ المحتاج: ۱۷۹/۹۔

حنابلہ : حنابلہ کی مشہور کتاب المغنی لابن قدامہ میں صراحت کے ساتھ حنابلہ کا مسلک عدم جواز کا مذکور ہے :

ولا یجوز قطع شیئ منه ولا جرحه ولا أخذ ماله لأن الشرع لم یرد بشیئ من ذلک عن أحد یقتدی به ۔ (۱)

ایک اور مشہور کتاب اقناع جلد: ۴،ص: ۲۷۰ میں عدم جواز کو ذکر کیا گیا ہے :

ولا یجوز قطع شیئ منه ولا جرحه ولا أخذ شیئ من ماله ۔ (۲)

البتہ علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے مشہور شاگرد علامہ ابن قیمؒ نے جواز کا قول پوری صراحت کے ساتھ اختیار کیا ہے؛ چنانچہ اپنی مشہور کتاب مجموع الفتاوی میں رقمطراز ہیں :

من قال : إن العقوبات المالیة منسوخة واطلق ذلک عن أصحاب مالک وأحمد فقد غلط علی مذهبهما ، ومن قاله مطلقاً من أی مذهب کان فقد قال قولا بلا دلیل ، ولم یجیء من النبی صلی الله علیه وسلم شیئ قطّ ، یقتضی أنه حرّم جمیع العقوبات المالیة ، بل أخذ الخلفاء الراشدون وأکابر أصحابه بذلک بعد موته دلیل علي أن ذلک محکم غیر منسوخ ۔ (۳)

اسی طرح کی بات علامہ ابن قیمؒ نے بھی پیش کی ہے۔(۴)

غور کیا جائے تو ہر مسلک میں کسی نہ کسی کا قول تعزیر مالی کے جواز کا موجود ہے، جیسا کہ احناف میں امام ابو یوسفؒ ، مالکیہ میں خود امام مالکؒ کا ایک قول ، امام شافعیؒ کا قول قدیم اور حنابلہ میں ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کا قول موجود ہے، اسی لئے حقیقت یہ ہے کہ ضرورت کے موقع پر اس قول سے استفادہ کی گنجائش ہے۔

بہ حالت ضرورت تعزیر مالی کے جواز کے قول سے استفادہ

جب اُمت کسی مشکل سے دو چار ہو اور ایک مسلک والے کے لئے اپنے مسلک پر عمل کرنے میں دشواری ہو تو دوسرے مسلک کی طرف عدول کی راہ ہموار ہو جاتی ہے، جیسا کہ طلاق وتفریق کے متعدد مسائل میں حنفیہ نے مالکیہ کی رائے کو قبول کیا ہے، تو جب عدول کی اجازت ہو جاتی ہے تو ضرورت کے موقع پر خود اپنے مسلک کے ضعیف قول پر عمل کی گنجائش کیوں نہیں ہوگی ، جب کہ فقہی کتابوں میں ایسے متعدد نظائر ہیں کہ مجبوری کی حالت میں ضعیف

(۱) المغنی: ۹/۱۷۸۔ (۲) اقناع: ۴/۲۷۰۔
(۳) مجموع الفتاوی: ۲۸/۱۱۱۔ (۴) دیکھئے: الطرق الحکمیۃ: ۱/۲۲۶۔

قول پر عمل کی اجازت دی گئی ؛ اسی لئے علامہ شامیؒ نے عقود رسم المفتی میں اُصولی طور پر یہ بات پیش فرمائی کہ ضرورت کے موقع پر ضعیف قول پر عمل کی اجازت ہے :

ولا يجوز بالضعيف العمل ولا به يجاب من جاء يسئل
إلا لعامل له ضرورة أو من له معرفة مشهورة (۱)

گوکہ اکابر کی تحریر میں مالی تعزیر کی اجازت نہیں ہے، اگر اجازت بھی ہے تو مجرم میں اصلاح آنے تک رقم روکنے اور پھر بعد میں واپس کرنے کی بات ہے، (۲) تاہم حضرت مولانا عبدالحیؒ اور معاصر علماء میں حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی حفظہ اللہ کی رائے میں جواز کی بات ہے، جس سے بہ وقت ضرورت استفادہ کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

تعلیمی اداروں میں طلبہ کی کوتاہیوں پر مالی جرمانہ لگانا

اس میں شبہ نہیں کہ مالی جرمانہ سے بچنا چاہئے ، اس لئے طلبہ کی کوتاہیوں پر سزا کا دوسرا متبادل حل تلاش کرنا چاہئے ، جیسے دینی مدارس میں معاملہ آسان ہے کہ وظیفہ روک لیا جائے ، یا کھانا کی مفت سہولت فراہم نہ کی جائے ؛ بلکہ مالی جرمانہ کی رقم کو ذہن میں ملحوظ رکھتے ہوئے اتنے ایام کی طعام فیس لی جائے وغیرہ ؛ البتہ عصری تعلیمی اداروں میں معاملہ قدرے مشکل ہے ؛ کیوں کہ عام طور پر ان اداروں میں وظیفہ دینے یا کھانا کھلانے کا نظم نہیں ہوتا ہے، ایسے اداروں میں مالی جرمانہ کے بجائے دوسرا راستہ سرزنش کا تلاش کرنا چاہئے اور مالی جرمانہ سے بچنا چاہئے ؛ لیکن اگر دوسرا راستہ نہ نکل رہا ہو تو کیا مالی جرمانہ کی اجازت ہوگی؟ تو جواب یہ ہے کہ ابتلاء عام اور تعامل ناس کی وجہ سے اسے حرام قرار نہ دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ یہ عمل مذہب کے ضعیف قول پر مبنی ہے، گویا اس نے اچھا نہیں کیا ؛ لیکن حرام کے دائرہ میں بھی نہیں ہے، جیسا کہ فقہی قاعدہ ہے: ''الأمر إذا ضاق اتسع''۔ (۳)

غیر تعلیمی اداروں کا مالی جرمانہ عائد کرنا

اس وقت مختلف ادارے والے نظم وضبط برقرار رکھنے کے لئے مالی جرمانہ عائد کر رہے ہیں اور یہ کافی عام بھی ہو چکا ہے، گویا ابتلاء عام ہے، یہاں بھی شرعاً یہی حکم ہوگا کہ نظم وضبط برقرار رکھنے کے لئے دوسرا متبادل راستہ تلاش کرنا چاہئے ؛ تاکہ مذہب کے راجح قول کے خلاف عمل نہ ہو، تاہم اگر ایسا نہ ہو سکے تو کوشش ہو کہ کم از کم صلاح آنے تک مال

(۱) شرح عقود رسم المفتی۔

(۲) دیکھئے: منتخبات نظام الفتاوی: ۲/۱۹۱، فتاوی دار العلوم: ۱۲/۲۲۴، کفایت المفتی: ۲/۱۶۶۔

(۳) الأشباہ والنظائر القاعدۃ الرابعۃ۔

روک کر رکھ لیا جائے اور بعد صلاح واپس کر دیا جائے اور اگر اس پر بھی عمل نہ ہو اور مالی جرمانہ لیا جا رہا ہو، تو ناپسندیدگی کے ساتھ یہ جائز ہوگا، حرام نہیں، جیسا کہ فقہی قاعدہ ہے: ''إن ما عمت بليته خفت قضيته''۔(۱)

برادری، پنچایت اور انجمن کا مالی جرمانہ عائد کرنا

اس سلسلہ میں حکم وہی ہے جو اوپر گذرا، یعنی مجبوری میں جائز ہے، مالی جرمانہ عائد کرنے سے پہلے متبادل راستہ تلاش کرنا چاہئے، اگر متبادل راستہ نہ ہو تو صلاح آنے تک مجرم کا مال روک کر رکھا جائے اور اگر یہ بھی دشوار ہو تو ناپسندیدگی کے باوجود تعزیر مالی کی اجازت ہوگی۔

موجودہ حالات میں شوہر پر متعہ یا متعین رقم یا مقررہ مہر میں نصف مہر کا اضافہ؟

مطلقہ کے لئے جن صورتوں میں متعہ مستحب ہے، ان میں متعہ کو واجب قرار دینا درست ہے یا نہیں؟ امام شافعیؒ کے نزدیک ایک صورت کے علاوہ باقی صورتوں میں متعہ واجب ہے، اور جس صورت میں متعہ واجب نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ مہر متعین ہو اور طلاق قبل الدخول ہو :

أوجب الشافعية المتعة إلا للمطلقة قبل الدخول التي سمى لها المهر والجمهور استحبوا المتعة ۔ (۲)

دکتور وہبہ زحیلیؒ کی خود ذاتی رائے متعہ کے وجوب کی ہے؛ لیکن جمہور کا مسلک استحباب کا ہے؛ البتہ حنفیہ کے نزدیک ایک صورت میں متعہ واجب ہے، جب کہ طلاق قبل الدخول ہو اور مہر متعین نہ ہو۔(۳)

گو کہ شوافع کے نزدیک متعہ واجب ہے؛ لیکن حنفیہ کا مسلک ایک صورت کے علاوہ وجوب کا نہیں ہے اور یہ مقررہ اصول ہے کہ بلا ضرورت دوسرے مسلک کی طرف عدول جائز نہیں ہے، جیسا کہ اس سے پہلے تفصیل سے پیش کیا گیا اور یہ بات بھی گذری کہ مجرم کی سرزنش کے لئے کوئی متبادل حل نہ ہو تو مالی تعزیر کی گنجائش ہے، گویا موجودہ حالات کے پس منظر میں جب مالی تعزیر سے استفادہ ممکن ہے تو اسی گنجائش سے فائدہ اُٹھایا جائے، مزید متعہ کے حکم میں تبدیلی نہ لائی جائے، متعہ کو مستحب ہی رکھا جائے کہ ضرورت کی تکمیل مستقل تعزیر مالی کے جواز اور اس پر عمل سے ممکن ہے، تاہم بہتر بات یہ ہوگی کہ مطلقہ کو مال دلانے کے لئے شوہر پر اخلاقی دباؤ ڈالا جائے کہ وہ متعہ کے طور پر مطلقہ کو مناسب رقم دے، اگر وہ قبول کر لے تو الگ سے مالی تعزیر کی ضرورت نہیں، اگر طلاق دینے والا اس پر آمادہ نہ ہو تو اب اس پر مالی تعزیر کی راہ سے مناسب رقم مقرر کر دی جائے، تو یہ بہتر ترتیب ہوگی۔

---

(۱) الأشباہ والنظائر القاعدۃ الرابعۃ۔ (۲) الفقہ الاسلامی وأدلتہ: ۹/ ۶۸۳۔

(۳) الفقہ الاسلامی وأدلتہ: ۹/ ۶۸۳۔

جہاں تک مہر مقرر میں نصف مہر کے اضافہ کی بات ہے تو اس کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ مہر کی مقدار شریعت نے مقرر نہیں کی ہے؛ بلکہ اسے فریقین کی رضامندی پر چھوڑ دیا ہے، گویا فریقین آپس میں کمی زیادتی کر سکتے ہیں، متعہ کی طرح نہیں ہے، متعہ کا حکم تو شرعاً متعین ہے کہ وہ مستحب ہے، اب استحباب کو وجوب سے بدلنا آسان کام نہیں؛ لیکن مہر کی مقدار میں کمی بیشی فریقین کے ذریعہ ممکن ہے، اگر شوہر نصف مہر کے اضافہ پر آمادہ ہو تو بہت اچھی بات ہے، اور اگر آمادہ نہ ہو تو پھر تعزیر مالی کے راستہ سے نصف مہر کے برابر اضافہ کر دیا جائے، اس صورت میں مہر تو وہی ہوگا، جو پہلے سے مقرر تھا، مزید نصف مہر کی حیثیت تعزیر مالی کی ہوگی، جس کی موجودہ حالات میں گنجائش ہوگی، تراضی فریقین سے مہر میں کمی بیشی کے لئے حسب ذیل عبارت ملاحظہ ہو :

> دل وضع المسئلة على جواز الزيادة في المهر بعد العقد وهي لازمة بشرط قبولها في المجلس على الأصح كما في الظهيرية واستدلوا بجوازها بقوله تعالى : ''ولا جناح عليكم فيما تراضيتم به من بعد الفريضة'' (۱) فإنه يتناول ما تراضوا على الحاقة واسقاطه ۔ (۲)

نکاح نامہ میں متعہ کے طور پر مقررہ رقم یا نصف مہر اضافی کا اندراج

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ طلاق کے بعد شوہر پر متعہ کو واجب قرار نہیں دیا جا سکتا، اخلاقی دباؤ ڈالا جا سکتا ہے، تاہم نکاح کے موقع ہی پر شوہر کو آمادہ کر لیا جائے اور وہ اپنی رضامندی سے متعہ کے طور پر ایک متعین رقم مقرر کرنے پر آمادہ ہو جائے اور اسے نکاح نامہ میں لکھ لیا جائے تو یہ بہتر بات ہوگی، اس صورت میں بعد طلاق متعہ کے طور پر مقررہ رقم کی ادائیگی اس پر لازم ہوگی، جیسا کہ حنابلہ کی رائے ہے کہ اس طرح کی شرطیں نکاح کے موقع پر لگا دی جائیں تو اس کو پورا کرنا واجب ہے، جیسا کہ حسب ذیل عبارت سے واضح ہے :

> جملة ذلک أن الشروط في النكاح تنقسم أقساما ثلاثة : أحدها ما يلزم الوفاء به وهو ما يعود إليها نفعه وفائدته ، مثل أن يشترط لها أن لا يخرجها من دارها أو بلدها أو لا يسافر بها أو لا يتزوج عليها ولا يتسّرى عليها ، فهذا يلزمه الوفاء لها به ،

---

(۱) النساء: ۲۴۔

(۲) البحر الرائق: ۲۶۱/۳۔

فإن لم يفعل فلها فسخ النكاح يروي هذا عن عمر ابن الخطاب ، وسعد بن أبي وقاص ، ومعاوية ، وعمرو بن العاص رضى الله عنهم وبه قال شريح وعمر بن عبد العزيز وجابر بن زيد وطاؤس والأوزاعي وإسحاق ۔ (۱)

نیز اسلامک فقہ اکیڈمی کے آٹھویں سیمینار منعقدہ علی گڑھ میں اشتراط فی النکاح کے موضوع پر جو فیصلے ہوئے ان میں ایک فیصلہ یہ ہے :

نکاح کے وقت ایسی باتوں کی شرط لگائی جائے کہ شریعت نے ان کو نہ لازم وواجب قرار دیا ہے اور نہ ان سے منع کیا ہے تو ایسی شرطوں کو پورا کرنا واجب ہے ۔ (۲)

اس فیصلہ کی روشنی میں بھی یہ بات جائز ہے کہ نکاح کے موقع پر نکاح نامہ میں متعہ کے طور پر ایک مقرر رقم کا اندراج کر دیا جائے کہ اس صورت میں طلاق کے بعد متعہ کے طور پر متعینہ رقم کی ادائیگی لازم ہوگی ۔

اگر متعہ کے طور پر ایک متعین رقم نکاح نامہ میں درج کرنے کی بجائے نصف مہر اضافہ کی بات لکھی جائے تو اس کی بھی گنجائش ہے ، جیسا کہ ماقبل میں گذرا کہ مہر کی رقم فریقین کی رضامندی سے طے کی جاتی ہے ، تو جب شوہر آمادہ ہو کہ بے جا طلاق یا تین طلاق کی نوبت آ گئی تو نصف مہر اضافہ کے ساتھ ادا کیا جائے گا تو اس کی رضامندی کے ساتھ اسے قبول کرنے میں مضائقہ نہیں ، پھر جب خدانخواستہ طلاق کی نوبت آ گئی تو نصف مہر اضافی کی بھی ادائیگی شوہر پر لازم ہوگی ، جیسا کہ حدیث ذیل سے بھی یہ مستفاد ہے :

أحق ما أوفيتم من الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج ۔ (۳)

سب سے زیادہ قابل ایفاء شرطیں وہ ہیں جن کے ذریعہ تم عصمتوں کو حلال کرتے ہو ۔

خلاصۂ جوابات

(۱) تعزیر بالمال اور تعزیر باخذ المال میں کوئی فرق نہیں ہے ۔

(۲) تعزیر بالمال کی بابت حنفیہ کا راجح قول عدم جواز کا ہے ۔

(۳) ائمہ احناف میں امام ابو یوسفؒ تعزیر بالمال کو جائز قرار دیتے ہیں جو مذہب کا ضعیف قول ہے ۔

---

(۱) المغنی : ۷ / ۹۳ ۔ (۲) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ، ص : ۱۵۰ ۔

(۳) مسلم : ۱ / ۴۵۵ ۔

(۴)　حنفی فقہاء میں قاضی علاء الدین طرابلسی صاحب خلاصۃ الفتاویٰ، صاحب فتاوی بزازیہ، مولانا عبدالحی لکھنوی اور حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب تعزیر مالی کے جواز کے قائل ہیں۔

(۵)　دیگر مسالک میں یعنی حنابلہ، مالکیہ اور شوافع کے نزدیک راجح قول کے مطابق تعزیر مالی جائز نہیں ہے۔

(۶)　امام شافعی کا قول قدیم، امام مالکؒ کی ایک روایت اور حنابلہ میں ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ اور مزید چند فقہاء کی رائے مالی تعزیر کے جواز کی ہے۔

(۷)　موجودہ حالات میں بہ وقت ضرورت تعزیر مالی کے جواز کے قول ضعیف پر عمل کی گنجائش ہے۔

(۸)　تعلیمی وغیر تعلیمی اداروں میں مالی جرمانہ عائد کرنا ابتلاء عام اور تعامل ناس کی بنیاد پر درست ہے۔

(۹)　خاندانی پنچایتوں اور اداروں کا مالی جرمانہ عائد کرنا درست ہے۔

(۱۰)　طلاق کے بعد متعہ کو واجب قرار نہیں دیا جاسکتا ہے؛ الا یہ کہ طلاق دینے والا اپنی رضامندی سے اس کو قبول کرلے، اسی طرح نصف مہر کو بغیر رضامندی کے اضافہ نہیں کیا جاسکتا ہے، الا یہ کہ وہ خوش دلی سے تیار ہوجائے۔

(۱۱)　اگر شوہر خوش دلی سے متعہ یا نصف مہر اضافی کے لئے تیار نہ ہو تو تعزیر مالی کی راہ سے سرزنش کی جائے۔

(۱۲)　نکاح کے موقع پر نکاح نامہ میں متعہ کے طور پر مقررہ رقم یا نصف مہر اضافی تراضی طرفین سے مقرر کرنا اور نکاح نامہ میں لکھنا درست ہے، جس کی پابندی بعد طلاق شوہر پر لازم ہوگی۔

● ● ●

والدین سے متعلق بعض ضروری احکام

مولانا محمد بن عبداللہ ندوی ☆

ماں باپ ایک عظیم نعمت

یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ ماں باپ خالق ارض وسماء کی طرف سے اولاد کے لئے ایک عظیم اور گراں قدر تحفہ ہیں، خدائی نعمتوں کا ایک حسین گلدستہ اور دنیا وآخرت کا بہترین سرمایہ ہیں، خدا کی خوشنودی، جہنم سے بچنے اور جنت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اس آیت: ''اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ'' (لقمان: ۱۴) ''تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر اور میری طرف سب کو لوٹ کر آنا ہے'' کے اندر جس طرح اپنی شکر کی تعلیم دی اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ یہ کوئی معمولی چیز نہیں؛ بلکہ ایک عظیم اور نایاب نعمت ہے، تم اس کی قدر کرو۔

اللہ عزوجل کے بعد اولاد کے لئے ماں باپ سے بڑھ کر کوئی شفیق ہے نہ کریم، غمخوار ہے نہ غمگسار، رحم دل ہے نہ نرم دل، جہاں ماں سراپا محبت ہے تو باپ سراپا شفقت، جہاں ماں ہر وقت اولاد پر اپنی جان نثار کرنے کے لئے کمربستہ رہتی ہے تو وہیں باپ ہر جانی و مالی مشقت کو برداشت کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، اولاد پر آنے والی مصیبتوں کی وجہ سے جہاں ماں پر حزن وملال، رنج والم، غم واندوہ کا سیاہ بادل چھاتا ہے تو باپ بھی اس میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔

ماں باپ اس اعتبار سے بھی اولاد کے لئے نعمت ہے کہ وہی ان کے وجود پذیر ہونے کا ظاہری سبب ہیں، علاوہ ازیں جب وہ دنیائے رنگ وبو میں قدم رکھتا ہے تو وہ بالکل نحیف وناتواں اور کمزور ہوتا ہے، نہ خود اُٹھ سکتا ہے، نہ بیٹھ سکتا ہے، نہ کھا سکتا ہے اور نہ پی سکتا ہے، نہ بول سکتا ہے، نہ کسی بات کو سمجھ سکتا ہے، حتیٰ کہ وہ اپنے کسی کام کو انجام بھی نہیں دے سکتا، ایسے وقت میں ماں ہی اسے محبت کے ساتھ اپنی چھاتی سے لگاتی ہے اور اپنے دُودھ سے سیراب کرتی ہے اور باپ ہی کا سایۂ شفقت اس کی پناہ گاہ ہوتا ہے، یہ دونوں مل کر اس کی پرورش کرتے ہیں، اس کے

☆ شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

کھے بغیر اس کی خوراک کا، اس کے بتلائے بغیر اس کی علاج کا، اس کی خواہش کے بغیر اس کی صفائی ستھرائی، لباس وپوشاک ودیگر ضروریات کا انتظام کرتے ہیں، پھر جب وہ بڑا ہوتا ہے تو ماں باپ ان کو تعلیم وتربیت کے زیور سے آراستہ وپیراستہ کرتے ہیں، اچھے، بُرے کی پہچان اور زندگی گزارنے کا طریقہ سکھاتے ہیں، بھائی بہنوں کے اختلافات کو ختم کر کے آپس میں اُلفت ومحبت، خوشی ومسرت ملائمت ومناسبت پیدا کرتے ہیں، ان کے درمیان اتحاد واتفاق ہمدردی وخیر خواہی کو فروغ دیتے ہیں اور دوٹوٹتے ہوئے خاندانی رشتہ کو جوڑ کر مزید اس میں جلا بخشتے ہیں اور اس کو جنت کا نمونہ بنا دیتے ہیں اور یہ ساری چیزیں وہ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے اندر اپنی اولاد کے تعلق سے ایک پاکیزہ جذبہ اور محبت موجزن ہیں؛ چنانچہ ماں باپ اندھیرے میں نور روشنی کی کرن اور ویرانے میں چمن ہیں، یہ دونوں دو ایسے پھول ہیں جو صرف سایہ ہی نہیں؛ بلکہ دھوپ میں بھی خوشبو پھیلاتے ہیں؛ لہٰذا بڑے ہونے اور شعور کی آنکھیں کھولنے کے بعد اولاد پر یہ فرض ہے کہ وہ خدا کے اس نایاب اور عظیم نعمت کی قدر کرے۔

حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے دن رات کی پانچوں نمازوں کو پڑھا تو اس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور جس نے ان پانچوں نمازوں کے بعد اپنے ماں باپ کے لئے دُعا کیا تو اس نے اپنے ماں باپ کا شکر ادا کیا۔(۱)

ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک

اسلام، دین رحمت ومذہب اُلفت ومحبت کا نام ہے، جو حیوانات، بناتات، جمادات ہر چیز کے ساتھ رحم وکرم، ہمدردی ورواداری، غمخواری وغمگساری، حسن عمل وحسن سلوک کی تعلیم دیتا ہے، صحیح مسلم میں ہے، شداد بن اوس فرماتے ہیں کہ میں نے دو چیزیں اللہ کے رسول ﷺ سے محفوظ کی ہیں، آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر چیز کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، تو جب تم (قصاص میں) کسی کو قتل کرو، تو قتل کرنے میں بھی حسن سلوک کو اپناؤ اور جانوروں کو ذبح کرو تو ذبح کرنے میں بھی بہتر طریقہ اختیار کرو۔(۲)

دنیا کے شاید کسی مذہب وصحیفۂ اخلاق وتعلیمات میں اس حسن سلوک کی تعلیم نہیں ملتی جس میں یہ کہا گیا ہو کہ وہ ہر چیز کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے؛ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب سے زیادہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے پر زور دیا ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کو اپنی توحید کے ساتھ اور ان کی نافرمانی وبدسلوکی کو اپنے شرک کے ساتھ ذکر کیا؛ چنانچہ سورۂ انعام میں فرمایا :

(۱) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۷/ ۱۴۳۔

(۲) صحیح مسلم، باب الأمر باحسان الذبح والقتل الخ، حدیث نمبر: ۱۹۵۵۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔ (الانعام:۱۵۱)

آپ کہئے کہ آؤ میں سنادوں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا باتیں حرام کی ہیں؟ یہ بات کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ، ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔

سورۂ نساء میں ارشاد فرمایا :

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔ (النساء:۵)

اور اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ، ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔

سورۂ بقرہ میں فرمایا :

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔ (البقرۃ:۸۳)

(اور یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ وہ صرف اللہ ہی کی عبادت کرے اور ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرے۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاں اپنی عبادت و وحدانیت کا ذکر کیا تو اس کے فوراً بعد ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کو جو ذکر کیا، اس کے چند وجوہات وخصوصیات ہیں اور وہ مندرجہ ذیل ہیں :

(الف) اللہ تبارک وتعالیٰ کے بعد اولاد پر سب سے زیادہ احسان و انعام ان کے ماں باپ کا ہے؛ کیوں کہ وہی ان کی پیدائش، ان کی تربیت، ان کی پرورش کا ذریعہ ہیں، ساتھ ہی وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فیوض وبرکات کو وجود میں لانے کا بھی سبب ہیں، ماں باپ کے علاوہ کوئی اس مقام کو حاصل نہیں کرسکتا، اگرچہ دوسرے افراد ان کی تربیت اور پرورش کا سبب ہوجائیں؛ لیکن وجود کا سبب ہرگز نہیں ہوسکتے۔

(ب) ماں باپ کا انعام زیادہ تر اللہ کے انعام سے مشابہ ہے؛ کیوں کہ جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے انعامات ونوازشات پر بندے سے کوئی عوض نہیں لیتا، اسی طرح ماں باپ اپنی اولاد کی تربیت پر کوئی تعریف، شکریہ، ثواب کا مطالبہ نہیں کرتے، برخلاف دوسرے لوگوں کی نوازش وانعام کے کہ ان کی اس میں کوئی نہ کوئی غرض ضرور موجود ہوتی ہے۔

(ج) جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں پر انعام کرنے سے نہیں اُکتاتا، اگرچہ بندہ عاصی ونافرمان ہی کیوں نہ ہو، ماں باپ بھی اپنی اولاد پر شفقت کرنے اور خیرخواہی سے نہیں اُکتاتے، اگرچہ اولاد ناخلف ہو۔

(د) جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتے ہیں کہ میرے بندے میری عبادت کریں، برائیوں سے بچیں، سیدھی راہ اختیار کریں، ماں باپ کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ ہماری اولاد کامیابی وترقی کی راہ پر گامزن ہو، دنیا وآخرت میں نیک نامی پیدا کرے، نیز اگر اولاد دنیا میں کامیابی وترقی سے ہمکنار ہوتی ہے تو ماں باپ ان سے حسد نہیں کرتے؛ بلکہ اس پر خوش ہوتے ہیں۔(۱)

یہ وہ چند اسباب وخصوصیات ہیں جو ماں باپ کے علاوہ کسی میں نہیں پائی جاتی، اسی واسطہ شریعت مطہرہ میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک واجب ہی نہیں؛ بلکہ فرض ہے۔

اللہ کے حبیب جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے پر بڑا زور دیا ہے اور اس کی اہمیت وفضیلت کو بڑے صاف اور اچھوتے انداز میں واضح فرمایا ہے؛ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے :

عن عبد الله قال : سألت النبی صلی الله علیه وسلم ای العمل احب الی الله عزوجل ؟ قال : الصلاة علی وقتها ، قال ثم أی ؟ قال : ثم بر الوالدین قال ثم أی ؟ قال الجهاد فی سبیل الله ۔ (۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے نبی ﷺ سے سوال کیا کہ کونسا عمل اللہ کو زیادہ محبوب ہے؟ فرمایا: وقت پر نماز پڑھنا، پھر میں نے عرض کیا، پھر کونسا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا، میں نے کہا پھر کونسا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔

ان نصوص کی روشنی میں فقہاء فرماتے ہیں کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا فرض عین ہے اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرنا حرام ہے، علامہ شامی رقمطراز ہیں :

فحیث ثبت انه فرض کان خلافه حراماً ۔ (۳)

حسن سلوک کے طریقے

مذہب اسلام میں جہاں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا تو وہیں ان کے ساتھ حسن سلوک کے طریقے بھی بتلائے گئے، ارشاد ربانی ہے :

---

(۱) مفاتیح الغیب او التفسیر الکبیر: ۲/ ۲۲۷، سورۃ البقرۃ: ۸۳۔

(۲) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب البر والصلۃ، حدیث نمبر: ۵۹۷۰، صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۱۳۹۔

(۳) ردالمحتار: ۶/ ۲۰۳، کتاب الجہاد، مطلب طاعۃ والدین فرض عین، مکتبہ زکریا۔

وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ، وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۔ (بنی اسرائیل:۲۳-۲۴)

اور آپ کے رب نے حکم دیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو، اگر تیرے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بوڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو کبھی ''ہوں'' بھی مت کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور یوں دُعا کرنا کہ اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحم فرمایئے، جیسا کہ انھوں نے مجھ کو بچپن میں پالا، پرورش کیا۔

اس آیت کریمہ کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی عبادت اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دینے کے بعد حسن سلوک کے طریقے بتلائے ہیں، احادیث میں بھی کثرت سے والدین کے ساتھ حسن سلوک کے طریقے بتلائے گئے ہیں، حافظ عبدالرحمٰن ابن الجوزی نے اپنی کتاب ''کتاب البر والصلۃ'' میں اس کو تفصیل سے ذکر کیا ہے اور تقریباً تمام احادیث کو ایک جگہ جمع فرمایا ہے، شاہ ولی اللہ الدہلویؒ نے بھی کچھ چیزوں کو اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تکمیل چند چیزوں کے ذریعہ ہوتی ہیں :

(۱) والدین کے پاس مال ومتاع نہ ہوں تو ان کو نان ونفقہ، خوراک وپوشاک دینا۔
(۲) اگر والدین کو خدمت کی ضرورت ہو تو ان کی خدمت کرنا۔
(۳) جب باپ بلائے تو حاضر ہونا۔
(۴) جب باپ کوئی حکم دے تو اس کو بجالانا، بشرطیکہ اس میں اللہ کی معصیت نہ ہو۔
(۵) بکثرت والدین کے پاس آمد ورفت رکھنا۔
(۶) ان کے ساتھ نرمی وشائستگی سے گفتگو کرنا۔
(۷) انھیں ''ہوں'' بھی نہ کہنا۔
(۸) ان کو نام لے کر نہ پکارنا۔
(۹) ان کے پیچھے چلنا۔
(۱۰) کوئی ان کی غیبت وبرائی کر رہا ہو یا ستا رہا ہو تو ان کا دفاع کرنا۔

(۱۱) اپنی مجلس میں باپ کی تعظیم کرنا۔

(۱۲) ان کے لئے دُعاءِ مغفرت کرنا۔(۱)

حالتِ نماز میں ماں باپ کی اطاعت

شریعت اسلامی میں نماز کی بڑی اہمیت ہے اوراس کی ادائیگی پر بڑا اجر وثواب ہے؛ لیکن جو اس کوادا نہ کرے یا اس کے ساتھ کھلواڑ کرے تو اس کے لئے اللہ کے یہاں بڑی وعیدیں اور سزائیں مقرر ہیں، نماز کسی صورت میں معاف نہیں اور نہ ہی اس کو چھوڑنے کی گنجائش ہے؛ البتہ بعض حالات ایسے ہیں جس میں اس کو چھوڑنے کی گنجائش تو نہیں؛ لیکن اس کو توڑنے یا اس میں تخفیف کرنے کی گنجائش ہے، اس سلسلہ کا ایک مسئلہ نماز میں ماں باپ کی اطاعت کا ہے، کہ اگر کوئی شخص حالت نماز میں ہو اوراس کے ماں باپ میں سے کوئی اس کو آواز دیں (خواہ کسی بھی وجہ سے) تو کیا اس حالت میں نماز توڑنا یا اسی حالت میں ان کا جواب دینا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ فرض یا واجب نماز پڑھ رہا ہے اوراسی اثناء میں ماں باپ میں سے کوئی اس کو پکاریں خواہ کسی مصیبت کے سبب یا اپنی مدد کی خاطر اور وہاں کوئی دوسرا شخص موجود نہ ہو اور اسے یقین ہو کہ اگر اس نے نماز نہیں توڑی تو ان کے مصیبت میں پڑ جانے کا قوی اندیشہ ہے تو ایسی حالت میں اس کے لئے اپنی نماز توڑ کر ان کی آواز پر لبیک کہنا واجب ہے؛ لیکن اگر انھوں نے یونہی پکارا ہے تو پھر اس کے لئے نماز توڑنا اوران کی آواز پر لبیک کہنا جائز نہیں، علامہ حصکفیؒ رقمطراز ہیں :

ولو دعاہ احد ابویہ فی الفرض لا یجیبہ الا ان یستغیث ۔ (۲)

البتہ علماء فرماتے ہیں کہ اگر چہ ماں باپ یوں ہی اس کو پکاریں، جب بھی اس کو چاہئے کہ وہ اپنی نماز میں تخفیف کر کے (جلدی پڑھ لے) ان کی آواز پر لبیک کہے :

ولکن العلماء یستحبون ان یخفف صلاتہ ویجیب ابویہ ۔ (۳)

اوراگر وہ سنن ونوافل پڑھنے میں مشغول ہے، پھر ماں باپ میں سے کوئی اس کو پکاریں اور ماں باپ کو اس بات کی خبر نہیں کہ میری اولاد نماز میں مشغول ہے تو اس حالت میں اس کے لئے نماز توڑ کر ان کا جواب دینا ضروری ہے (خواہ وہ کسی ضرورت سے پکار رہے ہوں یا بلا ضرورت یوں ہی)۔

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ: ۲/ ۳۸۱، تربیۃ الممالیک، کتاب البر والصلۃ: ۵۷، الباب السابع، مفاتیح الغیب: ۵/ ۲۵۹۔

(۲) الدر المختار علی رد المحتار: ۲/ ۵۰۴، کتاب الصلاۃ۔

(۳) تکملہ فتح الملہم: ۵/ ۳۳۳، باب تقدیم بر الوالدین، اجابۃ الوالدین فی الصلاۃ۔

لیکن اگر ماں باپ کو معلوم ہے کہ میری اولاد نماز میں مشغول ہے اور وہ یوں ہی بلاضرورت اس کو پکارے تو پھر اس کے لئے نماز توڑنا ضروری نہیں :

وفی النفل ان علم انه فی الصلاة فدعاه لا یجیبه والا اجابه ـ (۱)

ان الفرض اقوی منها بخلاف النفل ـ (۲)

ماں باپ کے حکم سے ترک جماعت

فرض نماز جماعت سے پڑھنا شعائر اسلام میں سے ہے، جس کی قرآن وحدیث میں بڑی تاکید وفضیلت آئی ہے، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے :

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ، أی صلوا مع المصلین ـ (۳)

نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھو، یعنی جماعت سے نماز پڑھو۔

حبیب خدا محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کی فضیلت یہ بیان فرمائی :

صلاة الجماعة تفضل صلاة الفذ بسبع وعشرین درجة ـ (۴)

جماعت کی نماز تنہائی کی نماز سے (فضیلت میں) ستائیس درجہ بڑھی ہوئی ہے۔

فرض نماز جماعت سے پڑھنے کے سلسلہ میں فقہاء اسلام کے مختلف آرا ہیں، فقہاء احناف میں سے بعض نے اس کو واجب اور بعض نے سنت مؤکدہ کہا ہے، جو کہ واجب کے قریب ہے، (۵) مالکیہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے، (۶) شوافع کے نزدیک فرض کفایہ، (۷) اور امام احمد کے نزدیک فرض عین ہے۔ (۸)

چنانچہ ماں باپ یا ان میں سے کوئی اپنی اولاد کو ترک جماعت کا حکم دیں تو امام احمدؒ کے نزدیک اس میں ماں باپ کی اطاعت لازمی نہیں :

---

(۱) الدر المختار علی رد المحتار: ۲/ ۵۰۴، کتاب الصلاة۔

(۲) رد المحتار: ۲/ ۵۰۴، کتاب الصلاة، باب ادراک الفرضیة۔

(۳) البقرة: ۴۳، روح المعانی: ۱/ ۳۹۲، مفاتیح الغیب: ۲/ ۶۵۔

(۴) صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب فضل صلاة الجماعة، حدیث نمبر: ۶۴۵۔

(۵) تحفة الفقہاء: ۱/ ۲۲۷، ط: بیروت، البحر الرائق: ۱/ ۳۴۴۔

(۶) الخرشی: ۲/ ۱۶، الشرح الصغیر: ۱/ ۴۲۴-۴۲۵۔

(۷) البیان: ۲/ ۳۶۱، کتاب المجموع: ۴/ ۶۳۔

(۸) الشرح الکبیر علی المقنع: ۱۰/ ۴۴۔

لانها فرض عين فلم يعتبر اذن ابوين فيها ۔ (۱)
اس لئے کہ یہ فرض عین ہے اور فرض عین میں ماں باپ کا حکم معتبر نہیں۔

امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام مالک کے نزدیک اگر ماں باپ ایک یا دو بار ترک جماعت کا حکم دیں تو ان کی اطاعت کرتے ہوئے ان کی بات مان لے اور اگر اس کی وہ عادت بنالیں تو پھر ان کی اطاعت جائز نہیں، شیخ ابوبکر طرطوشی فرماتے ہیں :

لا طاعة لهما في ترك سنة راتبة كحضور الجماعات وترك ركعتي الفجر والوتر ونحو ذلك اذا سألاه ترك ذلك على الدوام ۔ (۲)

البتہ بعض ضروری حالات میں انسان کے لئے کئی جماعتیں چھوڑنے کی بھی گنجائش ہے، جب کہ والدین کسی سخت مرض میں مبتلا ہوں اور انھیں اولاد کی خدمت کی ضرورت ہو۔

ماں باپ کے حکم سے ترک فرائض

ماں باپ اگر فرائض جیسے فرض نماز، روزہ وغیرہ چھوڑنے کا حکم دیں تو اس میں ان کی اطاعت جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ اللہ کا حق ہے اور اللہ کا حق ماں باپ کے حق سے بڑھا ہوا ہے، نیز اس کو چھوڑنے میں اللہ کی نافرمانی ہے اور جس چیز سے اللہ کی نافرمانی ہو اس میں کسی کی اطاعت جائز نہیں؛ چنانچہ حدیث پاک میں ہے :

لا طاعة لمخلوق في معصية الله عزوجل ۔ (۳)

نیز علامہ اوزاعیؒ فرماتے ہیں :

لا طاعة للوالدين في ترك الفرائض ۔ (۴)
والدین اگر فرائض کو چھوڑنے کا حکم دیں تو اس میں ان کی اطاعت جائز نہیں۔

ماں باپ کے حکم سے واجبات، سنن ونوافل کا چھوڑنا

ماں باپ کسی مجبوری کے پیش نظر واجبات وسنن مؤکدہ چھوڑنے کا حکم دیں تو اگر ایک دو بار چھوڑ دے تو

(۱) الشرح الکبیر علی المقنع: ۱۰/ ۴۴۔
(۲) الموسوعۃ الفقہیۃ: ۸/ ۷۱۔
(۳) ترمذی: ۱۷۰۷، مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۰۹۵۔
(۴) المغنی لابن قدامہ: ۱۳/ ۲۶، مسئلہ نمبر: ۱۶۲۶۔

جائز ہے اور اگر اس کی عادت بنالیں تو پھر ان کی اطاعت جائز نہیں، (۱) اور اگر وہ کسی شدید مرض میں مبتلا ہوں اور انھیں اس کی ضرورت ہوتو ایک دو سے زائد واجبات وسنن کو چھوڑ نا بھی جائز ہے اور اگر نوافل وسنن غیر مؤکدہ کو چھوڑنے کا حکم دیں تو اس میں ان کی اطاعت جائز ہے، اسی طرح فرض کفایہ جیسے نماز جنازہ کو چھوڑنے کا حکم دیں تو اگر دوسرے لوگ اس کو انجام دے سکتے ہوں تو ان کی اطاعت کرے ورنہ نہیں :

ضبطه ابن عطيه بوجوب طاعتهما فى المباحات فعلا وتركا واستحبابها فى المندوبات وفروض الكفاية كذا ۔ (۲)

ماں باپ کے حکم سے نماز مؤخر کرنا

ماں باپ کسی وجہ سے فرض نماز کو اول وقت میں پڑھنے سے منع کریں، یا اول وقت میں کسی چیز کا حکم دیں تو اولاد کو چاہئے کہ ان کی اطاعت کرے، اگر چہ اس سے اول وقت کی فضیلت فوت ہوجائے اور اگر اخیر وقت میں کسی کسی بات کا حکم دیں اور اسے یقین ہو کہ وہ اس چیز کو کرنے کے بعد نماز ادا کرسکتا ہے تو پھر ماں باپ کے حکم کو بجالائے؛ لیکن اگر وقت تنگ ہو اور صرف چند منٹ باقی رہ گئے ہوں اور اس نے ابھی تک فرض نماز نہیں پڑھی ہے تو پہلے نماز پڑھے اور اس کے بعد ان کے حکم پر عمل کرے، علامہ ابن حجر عسقلانیؒ تحریر فرماتے ہیں :

ومنه تقديمهما عند تعارض الامرين وهو كمن دعته امه ليمرضها مثلا بحيث يفوت عليه فعل واجب ان استمر عندها ويفوت ما قصدته من تأنيسه لها وغير ذلک لو تركها وفعله وكان مما يمكن تداركه مع فوات الفضيلة كالصلاة اول الوقت أوفى الجماعة ۔ (۳)

حج کے لئے والدین کی اجازت

حج دین کے بنیادی ستونوں میں سے ایک اہم ستون ہے، جس کی شریعت مطہرہ میں بڑی اہمیت وفضیلت ہے اور یہ اُمت کے ان افراد پر فرض ہوتا ہے، جو صاحب ثروت اور صاحب استطاعت ہوں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۔ (آلِ عمران:۹۷)

---

(۱) الموسوعۃ الفقہیۃ لکویت: ۸/۷۱۔

(۲) فتح الباری: ۱۰/ ۴۷۲، باب عقوق الوالدین من الکبائر۔

(۳) فتح الباری: ۱۰/ ۴۷۲، باب عقوق الوالدین من الکبائر۔

حج کی استطاعت پیدا ہونے کے بعد فوراً حج کر لینا ضروری ہے؛ البتہ بسا اوقات انسان صاحب استطاعت بھی ہوتا ہے اور حج پر قادر بھی؛ لیکن بعض اُمور کی وجہ سے اس کے لئے حج کرنا دشوار ہوجاتا ہے، تو ایسی صورت میں کبھی شریعت ان چیزوں کے پرواہ کئے بغیر حج کی اجازت دے دیتی ہے اور کبھی کچھ شرائط کے ساتھ اجازت دیتی ہے اور کبھی بالکل ہی اجازت نہیں دیتی، اس سلسلہ کا ایک مسئلہ حج میں والدین کی اجازت کا ہے کہ کیا والدین کی اجازت حج کے لئے ضروری ہے؟ تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ :

(الف) اگر کسی پر حج فرض ہو چکا ہے اور وہ حج کرنا چاہتا ہے؛ لیکن والدین اپنی محبت کے پیش نظر یوں ہی اسے حج کی اجازت نہ دیں، تو اس کے لئے اپنے ماں باپ کی اجازت کے بغیر حج پر جانا جائز؛ بلکہ اس میں ان کی اطاعت ہی جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ اللہ کا حق ہے اور ماں باپ کی اطاعت کرنے کی صورت میں اللہ کی نافرمانی ہے جو کہ جائز نہیں، آپ ﷺ کا پاک ارشاد ہے: ''لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق''۔(۱)

(ب) اگر ماں باپ بوڑھے ہوں اور وہ اس کی خدمت کے محتاج ہوں، نیز راستے بھی پُرخطر ہوں اور ان کا اس کے علاوہ کوئی بھی نہ ہو، جس کی وجہ سے وہ اجازت نہ دیں تو پھر اس کے لئے ان کی اجازت کے بغیر حج پر جانا درست نہیں۔

(ج) ماں باپ خدمت کے محتاج نہ ہو؛ لیکن راستے کے خطرات کے پیش نظر اس کو حج کے لئے اجازت نہ دیں تو یہ دیکھا جائے گا کہ راستے کے خطرات زیادہ ہیں یا کم، اگر زیادہ ہیں تو جائز نہیں اور اگر کم ہیں تو ان کی اجازت کے بغیر حج پر جانا جائز ہے؛ البتہ ان کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے :

ویـنبغی له تحصیل رضا من یکره له السفر بغیر رضاه فإنه إذا اراد أن یخرج الی الحج واحد ابویه کاره لذلک فأن کان محتاجا الی خدمته یکره وان کان متغنیا فلا بأس به اذا کان الغالب علی الطریق السلامة ، واما عند غلبة الخوف فلا یحل ان یخرج الا باذنهما و ان کانا مستغنین عنه ۔ (۲)

اگر کوئی نفل حج کرنا چاہے تو اس کے لئے ماں باپ کی اجازت کے بغیر حج کے لئے جانا جائز نہیں، خواہ راستے پر خطر ہوں، یا نہ ہوں :

(۱) ترمذی، حدیث نمبر: ۱۷۰۷، مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۰۹۵۔

(۲) غنیۃ الناسک: ۳۴، رد المحتار: ۹/ ۵۸۴، البحر العمیق: ۱/ ۳۸۸، فتاویٰ قاضی خان: ۱/ ۲۸۳۔

اما فی النفل فطاعة الوالدین اولی مطلقاً احتاجا الی خدمته اولا
وسواء کان الطریق مخوفاً اولا ۔(۱)

پہلے خود حج کرے یا والدین کو کرائے؟

شریعت کے جو احکام ہیں، وہ ہر ایک پر اس کے احوال کے اعتبار سے نافذ ہوتے ہیں، بعض دفعہ انسان پر ایک حکم فرض ہوتا ہے اور دوسرے پر نہیں؛ چنانچہ اگر اولاد پر حج فرض ہو چکا ہو اور والدین پر نہیں تو اولاد کو چاہئے کہ وہ پہلے خود حج کرے؛ کیوں کہ فریضۂ حج اس سے متعلق ہے نہ کہ والدین سے، ہاں اگر اس کے اندر اتنی استطاعت ہو کہ وہ والدین کو اپنے ساتھ حج کے لئے لے جا سکتا ہو تو بہتر ہے، ورنہ بعد میں اگر کبھی اللہ تعالیٰ وسعت دے تو خود نفلی حج نہ کر کے اپنے ماں باپ کو حج کرا دے کہ یہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ایک طریقہ ہے۔(۲)

نکاح میں والدین کی اطاعت اور ان کی پسند کا لحاظ

شریعت نے نکاح کرنے والوں کی پسند اور ناپسند کو بہت زیادہ اہمیت دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے عورت کے سلسلہ میں فرمایا کہ: شوہر دیدہ عورت کا نکاح اس کے مشورہ کے بغیر اور کنواری لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے۔(۳)

البتہ بالغ لڑکے اور لڑکیوں کو یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ والدین کو راضی رکھنا اور ان کی خوشی کو اپنی خوشی پر مقدم رکھنا بڑی سعادت کی بات ہے اور ان کو ناراض رکھنا بڑی بدبختی کی بات ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا :

رضا الرب فی رضی الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد ۔(۴)

باپ کی رضامندی میں رب کی رضامندی ہے اور باپ کی ناراضگی میں رب کی ناراضگی ہے۔

مزید یہ کہ والدین چوں کہ اپنی اولاد کے حق میں زیادہ مہربان اور زیادہ مشفق ہوتے ہیں اور انھیں اولاد کی زیادہ فکر بھی ہوتی ہے، نیز لوگوں کے حالات سے وہ جتنا واقف ہوتے ہیں، خود یہ لڑکا اور لڑکی نہیں ہوتے؛ لہٰذا اگر والدین کوئی مناسب رشتہ طے کر دیں تو اولاد کو چاہئے کہ وہ بخوشی اس کو قبول کر لیں؛ کیوں کہ ممکن ہے کہ وہ اس کے حق میں زیادہ نفع بخش ہو۔

---

(۱) غنیۃ الناسک: ۳۴، باب ما ینبغی لمرید الحج من آداب سفر۔
(۲) ملخص از: کتاب الفتاویٰ: ۴/ ۹۹، فتاویٰ محمودیہ: ۱۵/ ۳۶۴۔
(۳) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۱۳۶، سنن الترمذی: ۱۱۰۷۔
(۴) ترمذی، حدیث نمبر: ۲۰۲۰۔

نیز اگر والدین ایسی جگہ رشتہ کرنا چاہیں جہاں ان کا دل بالکل آمادہ نہ ہوتو اولاد کو چاہئے کہ وہ نرمی سے والدین کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس رشتہ کے بارے میں بتادے کہ یہ رشتہ مجھے پسند نہیں اور انھیں راضی کر کے دوسری جگہ رشتہ کرانے کی کوشش کرے؛ البتہ اگر وہ والدین کے طے شدہ رشتہ کو ترجیح دے اور اس کو قبول کرلے تو یہ مستحب ہے؛(۱) لیکن اگر والدین لڑکی کا نکاح زبردستی کرہی دیں تو فقہاء اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ یہ سنت کے خلاف ہے اور یہ لڑکی کی اجازت پر موقوف رہے گا :

وان زوجها بغير استئمار فقد اخطأ السنه وتوقف على رضاها ۔ (۲)

والدین کے حکم سے طلاق

اسلام نہ تو طلاق کو پسند کرتا ہے اور نہ ہی طلاق دینے والے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے؛ بلکہ اس کو ابغض المباحات قرار دیتا ہے، حدیث پاک میں ہے :

ابغض الحلال الی الله عزوجل الطلاق ۔ (۳)

اللہ عزوجل کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ وناگوار چیز طلاق ہے۔

لیکن بعض مرتبہ مزاج کی ناموافقت کی وجہ سے حالات ناسازگار ہوجاتے ہیں اور بظاہر نباہ مشکل ہونے لگتا ہے، ان حالات میں شوہر کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ درج ذیل ترتیب سے اپنی بیوی کی اصلاح کی کوشش کرے، ارشاد ربانی ہے :

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۔ (النساء:۳۴)

اورتم کو جن عورتوں سے نافرمانی کا اندیشہ ہوتو ان کو سمجھاؤ، خوابگاہ میں ان سے بے تعلقی برتو اور ان کو ہلکے طریقہ پر مارو، اگر وہ تمہاری فرمانبرداری کرنے لگیں تو پھر ان پر زیادتی کے لئے بہانے تلاش مت کرو۔

لہٰذا جب میاں بیوی کے تعلقات خوشگوار ہوں اور بیوی کی طرف سے شریعت کے مقرر کردہ فرائض کی ادائیگی میں ناقابل عفو کوتاہی نہ ہو اور والدین کسی اختلاف یا سسرالی جھگڑے کی وجہ سے بیٹے کو یہ حکم دے کہ وہ

(۱) ضبطه ابن عطيه بوجوب طاعتهما في المباحات فعلا وتركا واستحبابها في المندوبات، فتح الباري: ۱۰/ ۴۰۷، باب عقوق الوالدين من الكبائر۔

(۲) ردالمحتار: ۴/ ۱۵۹، کتاب النکاح، باب الولی۔

(۳) سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی کراھیۃ الطلاق، حدیث نمبر: ۲۱۷۸۔

اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو ایسی حالت میں محض والدین کی خواہش پر بیوی کو طلاق دینا جائز نہیں، اگر چہ قرآن وحادیث میں کثرت سے والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کا ذکر ملتا ہے اور یہ بات بھی صراحت سے ملتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ سے خواہش کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں، حضرت عبداللہؓ کو اپنی بیوی سے کافی محبت تھی اور وہ طلاق دینا نہیں چاہتے تھے؛ لیکن جب حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی تو آپ ﷺ نے حضرت عبداللہؓ کو اپنے والد کا حکم ماننے کی ترغیب دی، بلاآخر انھوں نے حضور ﷺ کے مشورہ سے اپنی بیوی کو طلاق دے دی؛(۱) لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے حق گو اور حق پسند شخصیت سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ انھوں نے بلا وجہ طلاق جیسے انتہائی اقدام کا مطالبہ اپنے لڑکے سے کیا ہو، یقیناً انھوں نے کوئی ایسی بات محسوس کی ہوگی جس کا تقاضا ہوگا کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اپنی اس بیوی کو علاحدہ کردیں؛ البتہ اس کا اصل سبب کیا تھا؟ روایات میں اس کی وضاحت نہیں؛ کیوں کہ بیوی، بہو سے متعلق کوئی بھی شریف انسان کمزوریوں اور کوتاہیوں کو بیان کرنے سے احتراز کرتا ہے اور کرنا بھی چاہئے، ورنہ ظاہر ہے کہ بلا وجہ بیوی کو طلاق دینا معصیت اور سخت گناہ ہے اور معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔(۲)

امام احمد بن حنبلؒ کے پاس ایک شخص آکر کہنے لگا کہ میرے والد مجھے اپنی بیوی کو طلاق دینے کو کہتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق مت دو، اس پر اس نے کہا کہ کیا حضرت عمرؓ نے اپنے لڑکے حضرت عبداللہؓ سے اپنی بیوی کو طلاق دینے کو نہیں کہا تھا؟ آپ نے فرمایا ''ہاں'' کہا تو تھا؛ لیکن کیا تمہارے والد حضرت عمرؓ کی طرح ہیں؟ یعنی تم اپنی بیوی کو اپنے والد کے حکم سے طلاق مت دو، ہاں اگر تمہارے والد حضرت عمرؓ کی طرح حق پسند اور عدل پسند ہو جائیں تو تم اپنی بیوی کو طلاق دے سکتے ہو۔(۳)

نیز یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ جس معاشرے میں تھے، وہ عربی معاشرہ تھا اور عربوں کے معاشرہ میں مطلقہ عورت کے نکاح کا مسئلہ بڑا آسان تھا، عدت گزرنے نہ پاتی تھی کہ رشتہ آنے لگتے تھے؛ لیکن آج کے معاشرے میں مطلقہ عورتوں کا نکاح نہایت ہی مشکل ہے؛ بلکہ بعض دفعہ کنواری لڑکیوں ہی کا نکاح بڑی مشکل سے ہو پاتا ہے، چہ جائیکہ بیوہ اور مطلقہ عورتوں کا نکاح۔

---

(۱) سنن الترمذی، الطلاق واللعان، حدیث نمبر:۱۱۸۹۔

(۲) مسند احمد، حدیث نمبر:۱۰۹۵، سنن الترمذی، حدیث نمبر:۱۷۰۷۔

(۳) الموسوعۃ الفقہیۃ:۸/۷۲۔

لہٰذا آج کے معاشرے میں حریصانہ مطالبات، خدمت کا مبالغہ آمیز تصور اور بہو سے نوکرانی کی طرح کام لینے کے مزاج کے پس منظر میں ماں باپ اگر بیٹے سے بہو کو طلاق دینے کا مطالبہ کرے تو لڑکوں کے لئے ایسے حالات میں اپنی بیوی کو طلاق دینا جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ عورت کے لئے شدید ضرر اور اذیت کا باعث ہے، نیز اگر کبھی خدانخواستہ ایسا واقعہ پیش آ ہی جائے کہ واقعی والدین اس میں حق بجانب ہو تو ایسے حالات میں بھی اولاد کو چاہئے کہ پہلے علماء اور اربابِ افتاء سے مشورہ لے کر پھر کوئی قدم اُٹھائے اور اگر مجبوراً طلاق دینے کی نوبت آ جائے تو پھر ایسی صورت میں صرف ایک طلاق دے اور ایسے وقت میں دے جب عورت ایام حیض سے نکل کر طہر میں داخل ہوگئی ہو اور اس طہر میں ہم بستری کی نوبت نہ آئی ہو :

طلقة رجعية فقط فی طهر لا وطئ فيه وتركها حتى تمضى عدتها ۔ (۱)

بہو پر والدین کا حق

اولاد کی بیویوں (بہو) پر شرعاً ان کے ساس سسر کا نہ نفقہ واجب ہے اور نہ ہی ان کی خدمت؛ لیکن اخلاقی طور پر بہو کو اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ ان کے شوہر کے والدین ہیں اور جس طرح اپنے والدین اور اپنے شوہر کو آرام وراحت پہنچانے کا خیال رکھتی ہے، ساس سسر کا بھی خیال رکھے؛ کیوں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب اس کے شوہر گھر پر نہیں ہوتے اور وہ کسی پریشانی سے دوچار ہوتی ہے، تو ساس سسر ہی اس کا خیال رکھتے ہیں اور حتی الامکان اس کی پریشانیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، نیز اس سے آپسی تعلقات خوشگوار ہوتا ہے اور گھر بار بھی آباد رہتا ہے۔

جو عورت اپنے ساس سسر کا خیال نہیں رکھتی، اکثر اس کے خاندان میں انتشار و بدامنی پھیلی رہتی ہے اور بسا اوقات ساس سسر اپنی اولاد سے مطالبہ کر کے بہو کو طلاق دلوا دیتے ہیں اور اگر کبھی ایسا نہیں ہو پاتا تو خود ساس سسر اپنی اولاد سے قطع تعلق کر لیتے ہیں اور آپس میں رسہ کشی رہتی ہے۔

شوہر کو چاہئے کہ وہ اپنی بیویوں کو بڑی نرمی ومحبت کے ساتھ سمجھائیں کہ میں جس طرح تمہارا خیال رکھتا ہوں، تم بھی میرے اور میرے والدین کا خیال رکھو اور ان کو اپنے ماں باپ جیسے سمجھو اور ان کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھو۔

بہو کو چاہئے کہ وہ اپنے ذہن میں اس بات کو بیٹھا لے کہ اس پر اس کے شوہر کے متعدد حقوق ہیں؛ لہٰذا اگر شوہر اسے جائز امر کا حکم کرے تو اُسے بجالانا واجب ہے، اسی طرح اگر وہ اپنے والدین کی خدمت اور ان کے ادب واحترام کا حکم دیں تو بہو کو چاہئے کہ وہ اسے بخوشی قبول کر لے؛ کیوں کہ ہر شوہر کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے والدین خوش رہیں اور اس کی بیوی اپنے ساس سسر کی خدمت کرے :

وحقه عليها ان تعطيه فی كل مباح يامرها به ۔ (۲)

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار: ۴/۴۳۲، کتاب الطلاق۔ (۲) الدرالمختار علی ردالمحتار: ۴/۳۸۸، کتاب الرضاع۔

ماں باپ سے الگ رہنا

معاشرے میں ماں باپ سے الگ رہنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے؛ حالاں کہ بعض دفعہ ساتھ رہنے میں والدین اور اولاد کی بیویوں میں ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں نااتفاقیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور بسااوقات والدین اوراولاد میں سے کسی کے اندر چڑچڑاپن ہونے کی وجہ سے دونوں میں ذہنی کشمکش رہتی ہے اور ایسی صورت میں اولاد سے نافرمانیاں سرزد ہوجاتی ہیں۔

لہٰذا اگر اولاد معاشرتی مصالح کے پیش نظر والدین سے الگ رہیں اور والدین کے جو حقوق ان پر ہیں، اس کو ادا کرتے رہیں تو یہ جائز ہی نہیں؛ بلکہ یہ ماں باپ کی فرمانبرداری میں شامل ہے، اسی وجہ سے فقہاء فرماتے ہیں کہ صلہ رحمی بہرصورت ہر حال میں واجب، خواہ سلام وکلام کے ذریعہ ہو، یا تعاون وتکافل کے ذریعہ، علامہ حصکفیؒ رقمطراز ہیں :

وصلة الرحم واجبة ولو كانت بسلام وتحية وهدية ومعاونة وبمجالسة ومكالمة وتلطف واحسان ويزورهم غباليز يدحبا ۔ (۱)

لیکن عصر حاضر میں والدین کے سلسلہ میں بڑی کوتاہیاں ہورہی ہیں، اکثر نوجوان شادی کرنے کے بعد اپنی بیویوں کے ساتھ والدین سے الگ مقیم ہوجاتے ہیں، اور والدین کو ماہانہ ایک متعین مقدار میں رقم وغیرہ دینے کو اپنی خدمت سمجھتے ہیں؛ حالاں کہ والدین کے اور بھی دیگر ضروریات وتقاضے ہیں؛ لہٰذا اولاد کو چاہئے کہ حتی الامکان وہ والدین ہی کے ساتھ رہے، یا انھیں اپنے ساتھ رکھے؛ البتہ اگر ساتھ رکھنے کی کوئی صورت نہ ہوتو ادب واحترام اور نرمی کے ساتھ والدین کو سمجھادے کہ ان وجوہات کی وجہ سے وہ مجبوراً علاحدہ رہتے ہیں، نیز ان کی خدمت میں کوئی کوتاہی وکمی نہ کرے، ان کے پاس کثرت سے آتا جاتا رہے، ان کی ضروریات کا پتہ لگاتا رہے، ان سے محبت میں کوئی کمی نہ کرے تو انشاءاللہ یہ ان کی جانب سے فرمانبرداری سمجھی جائے گی، ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں :

وبالوالدين احسانا فانه دل على الاجتناب عن جميع الاقوال المحرمة والاتيان بجميع كرائم الاقوال والافعال من التواضع والخدمة والانفاق عليهما ثم الدعاء لهما في العاقبة ۔ (۲)

شادی شدہ عورت پر والدین کا حق

عورتوں کی شادی ہونے کے بعد ان پر ان کے شوہروں کی اطاعت وفرمانبرداری لازم ہے، احادیث میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے، ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ عورت کو اس کے شوہر کے جائز اُمور کو بجالانے پر مامور کیا گیا ہے :

---

(۱) الدرالمختار علی ردالمحتار: ۵۸۹/۹۔ (۲) مرقاۃ المصابیح: ۱۹۱/۹، کتاب البر والصلۃ۔

لأنها أي المرأة كانت مامورة الى طاعة زوجها في غير معصية ۔ (۱)

لیکن یہ بات بھی برحق ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ماں باپ کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے اور اس میں عورت ومرد سب برابر ہیں؛ لہٰذا جس طرح شوہر کی اطاعت لازم ہے، ماں باپ کی اطاعت بھی لازم ہے۔

البتہ بعض دفعہ بیٹیوں کو اس کے والدین ایسی باتوں کا حکم کرتے ہیں، جو ان کے شوہر کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے، اسی طرح بسا اوقات شوہر اپنی بیوی کو ایسی بات کا حکم دیتے ہیں، جو عورت کے ماں باپ کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے تو ایسی حالت میں عورتوں کو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ شوہر اور والدین میں سے جو جائز اور حق بات کا حکم دے اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرے :

لا طاعة أي لاحد من الامام وغيره كالوالد والشيخ في معصية ۔ (۲)

حصولِ علم کے لئے سفر اور والدین کی اجازت

حصولِ علم کے لئے سفر کرنے کی بڑی فضیلت ہے، حدیث میں ہے اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا :

من خرج في طلب العلم فهو في سبيل الله حتى يرجع ۔ (۳)

جو شخص تعلیم حاصل کرنے کے لئے (اپنے گھر سے) نکلے تو وہ اللہ کے راستہ میں ہے، یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے۔

علم حاصل کرنے کے لئے سفر کرنے کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے، پچھلی شریعت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے علم حاصل کرنے کے لئے سفر کیا، عہد نبوی میں بھی یہ سلسلہ رہا، آپ علیہ السلام کے زمانہ میں کچھ لوگ یمن سے علم حاصل کرنے کے لئے آپ ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے علم حاصل کیا اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا کہ کیا کسی کے لئے حصول علم کی خاطر رخت سفر باندھنا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، آپ ﷺ کے اصحاب نے اور ان کے بعد کے لوگوں نے اس کے لئے سفر کیا ہے۔(۴)

فقہاء نے حصولِ علم کے لئے سفر کرنے کی مطلق اجازت دی ہے؛ البتہ جس کے والدین موجود ہوں تو ان سے اجازت لینے اور نہ لینے کے سلسلہ میں تھوڑی تفصیل کرتے ہیں: احناف دو شرطوں کے ساتھ اس کی اجازت دیتے ہیں :

(۱) مرقاۃ المصابیح: ۶/ ۲۶۷۔ (۲) مرقاۃ المصابیح: ۷/ ۲۰۰، کتاب الامارۃ والقضاء۔

(۳) سنن الترمذی، ابواب العلم، حدیث نمبر: ۲۶۴۷۔ (۴) الموسوعۃ الفقہیۃ: ۲۹/ ۸۲۔

(الف) اگر کسی کے والدین موجود ہوں اور وہ خوشحال ہوں اور اس پر اس کے والدین کا نفقہ واجب نہ ہو اور نہ ہی اس کے گھر سے نکلنے کی وجہ سے والدین کی جان کو خطرہ ہو تو پھر اس کے لئے ماں باپ کی اجازت کے بغیر حصولِ علم کے لئے نکلنا جائز ہے اور اگر ماں باپ تنگ دست ہوں اور ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہو اور اس کے گھر سے نکلنے کی وجہ سے والدین کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر ماں باپ کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنا جائز نہیں۔

(ب) راستہ مامون ہو تو ماں باپ کی اجازت کے بغیر حصول علم کے لئے نکلنا جائز ہے اور اگر راستہ مامون نہ ہو اور سفر علم میں نکلنے سے خود ان کی جان کو خطرہ ہو اور والدین ان خطرات کے پیش نظر اس کو اجازت نہ دے تو اس کے لئے ماں باپ کی اجازت کے بغیر نکلنا جائز نہیں، خواہ ماں باپ خوشحال ہو یا تنگ دست اور خواہ ماں باپ کا نفقہ اس پر واجب ہو یا نہ ہو:

لا يحل سفر فيه خطر الا بأذنهما ومالا خطر فيه يحل بالاذن ومنه السفر في طلب العلم ۔ (۱)

ومنه السفر في طلب العلم ... إذا كان الطريق امنا ولم يخف عليها الضيعة ۔ (۲)

جماعت میں جانے کے لئے والدین کی اجازت

جماعت میں جانا نہ تو فرض ہے اور نہ واجب؛ البتہ بقدرِ ضرورت علم دین حاصل کرنا فرض ہے:

طلب العلم الشرعي فريضة أي مفروض فرض عين على كل مسلم ۔ (۳)

علم دین انسان خواہ مدرسہ میں داخلہ لے کر حاصل کرے، یا خارج مدرسہ پڑھ کر، اہل علم کی مجلس میں بیٹھ کر حاصل کرے، یا اہل دین کی خدمت میں رہ کر، تبلیغی جماعت میں جا کر حاصل کرے یا گھر بیٹھے کسی معلم سے پڑھ کر، بہر حال بقدرِ ضرورت علم دین جس طرح بھی حاصل ہو سکتا ہو حاصل کرنا فرض عین ہے۔

لہٰذا اگر کوئی شخص بقدرِ ضرورت علم دین سے واقف نہ ہو اور نہ ہی اس کے پاس اب اتنا وقت ہو کہ وہ باضابطہ کسی مدرسہ میں داخل ہو کر علم دین حاصل کر سکے؛ البتہ وہ جماعت میں جا کر دین سیکھ سکتا ہو تو اس کے لئے

(۱) الدر المختار علی رد المحتار: ۶/۱۵۵۔

(۲) رد المحتار: ۶/۱۵۵، کتاب الجہاد، ط: بیروت۔

(۳) مرقاۃ المصابیح: ۱/۲۸۴، کتاب العلم۔

اپنے والدین کی اجازت کے بغیر جماعت میں جانا جائز ہے، اگر والدین جماعت میں جانے سے روکیں تو ان کی اطاعت جائز نہیں: ''لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق''۔(۱)

اور اگر وہ بقدرِ ضرورت علم دین سے واقف ہو اور اس کے ذمہ والدین کا نفقہ ہو، یا ان کا نفقہ اس کے ذمہ تو نہ ہو؛ البتہ والدین ضعیف یا بیمار ہوں اور انھیں جسمانی خدمت کی ضرورت ہو تو اس کے لئے والدین کی اجازت کے بغیر جماعت میں جانا جائز نہیں؛ کیوں کہ اس کے جانے سے حقوق واجبہ تلف ہوں گے جو شریعت میں جائز نہیں :

قالوا ان استغنی الاب عن خدمته فلا بأس والا فلا یسعه الخروج ۔ (۲)

اور اگر ماں باپ کا نفقہ اس کے ذمہ واجب نہ ہو اور نہ ہی وہ اس کی خدمت کے محتاج ہوں ، پھر وہ اسے جماعت میں جانے سے منع کریں تو اگر وہ ماں باپ کے منع کرنے کے بعد بھی جماعت میں چلا جائے تو وہ گنہگار نہیں ہوگا :

وله الخروج لطلب العلم الشرعی بلا اذن والدیه أی ان لم یخف علی والدیه الضیعة بأن کانا مؤسرین ولم تکن نفقتهما علیه ۔ (۳)

البتہ اولاد کو چاہئے کہ وہ اس حالت میں بھی والدین کی رضامندی حاصل کرے ؛ کیوں کہ والدین کو ناراض کرنا اچھی بات نہیں ۔

دورِ حاضر میں اکثر ہوتا یہ ہے کہ لڑکے اپنے ساتھیوں کے کہنے یا کسی اہل علم سے جماعت میں جانے کی فضیلت سننے کے بعد فوراً اپنا نام جماعت میں لکھا دیتے ہیں، اور ماں باپ کی اجازت کا بالکل خیال نہیں رکھتے ،جس کی وجہ سے اس سے دو گناہ سرزد ہو جاتے ہیں، اول یہ کہ جب اس نے اپنا نام جماعت میں لکھا دیا، پھر والدین نے جماعت میں جانے سے منع کر دیا تو اس نے جو جماعت والوں سے وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی ہوئی جو کہ گناہ ہے، دوسرا یہ کہ اگر وہ جماعت میں نام لکھانے کے بعد والدین سے اجازت لئے بغیر جماعت میں چلا گیا تو والدین سے اجازت نہ لینے کی وجہ سے وہ گنہگار رہوا؛ لہٰذا اگر کسی کو جماعت میں جانا ہی ہو تو وعدہ کرنے سے پہلے ماں باپ کی اجازت لے، پھر وعدہ کرے اور جب ماں باپ اجازت دے دیں تو پھر وہ اپنا نام جماعت میں لکھائے۔

• • •

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۰۹۵، سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۱۷۰۷، باب ما جاء لمخلوق فی معصیة الخالق۔

(۲) الدر المختار علی رد المحتار: ۵/۲۶۱۔ (۳) رد المحتار: ۹/۵۸۴، الفتاویٰ الہندیہ: ۵/۳۶۶۔

موجودہ دور میں سیکولر ملکوں کا شرعی حکم

مولانا احمد نور قاسمی ☆

فقہاء نے مسلمانوں کے غالب ومغلوب اور خائف ومامون ہونے کی حیثیت سے مملکتوں کی دو قسمیں کی ہیں: دار الاسلام اور دار الحرب، ان دونوں داروں (مملکتوں) کی تعریف مختلف الفاظ میں ملتی ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کو غلبہ وامن حاصل ہو وہ دار الاسلام ہے اور جہاں صورتِ حال اس کے برعکس ہو وہ دار الحرب ہے؛ چنانچہ شرح السیر الکبیر میں ہے:

فإن دار الإسلام اسم للموضع الذی یکون تحت ید المسلمین ۔ (۱)

مسلمانوں کے زیر قبضہ علاقہ کا نام دار الاسلام ہے۔

جامع الرموز میں ہے:

دار الإسلام ما یجری فیه حکم إمام المسلین وکانوا فیه اٰمنین ، ودار الحرب ما یجری فیه أمر رئیس الکافرین ۔ (۲)

دار الاسلام وہ ہے جہاں مسلمانوں کے حکمراں کا حکم چلتا ہو اور مسلمان وہاں مامون ہوں اور دار الحرب وہ ہے جہاں کافروں کے سردار کا حکم چلتا ہو۔

درمختار کی عبارت ہے:

ودار الحرب تصیر دار الإسلام بإجراء أحکام أهل الإسلام بها ۔ (۳)

اسلامی احکام کے نفاذ سے دار الحرب دار الاسلام میں بدل جاتا ہے۔

بدائع میں دار الکفر کی تعریف یوں منقول ہے:

لا خلاف بین أصحابنا فی أن دار الکفر تصیر دار الإسلام بظهور أحکام الإسلام بها ۔ (۴)

☆ استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۱) شرح السیر الکبیر: ۸۶/۲۔

(۲) جامع الرموز: ۵۵۶/۴۔ (۳) درمختار: ۲۸۸/۶۔ (۴) بدائع الصنائع، کتاب السیر: ۱۱۲/۶۔

فقہ مالکی میں ان داروں کی تعریفیں ان الفاظ میں مذکور ہیں :

لأن بلاد الإسلام لا تصير دار حرب بمجرد استيلائهم عليها ؛ بل حتى تنقطع إقامة شعائر الإسلام عنها ، وأما مادامت شعائر الإسلام أو غالبها قائمة فيها فلا تصير دار حرب ۔ (۱)

کیوں کہ دارالاسلام محض کفار کے غلبہ کی وجہ سے دارالحرب نہیں ہوجاتا؛ تا آں کہ اسلامی شعائر کا قیام منقطع ہوجائے ؛ جب تک اسلامی شعائر تمام یا اکثر مملکت میں قائم ہوں وہ دارالحرب نہیں ہوگا۔

فقہ شافعی میں یہ تعریف یوں مذکور ہے :

(فی دار الإسلام) أی بأن يسكنها المسلمون و إن كان فيها أهل ذمة أو فتحها المسلمون وأقروها بيد الكفار أو كانو يسكنونها ثم جلاهم الكفار عنها ، شرح الروض ۔ (۲)

دارالاسلام وہ ہے جہاں مسلمان رہتے ہوں، اگرچہ وہاں اہل ذمہ بھی ہوں یا جیسے مسلمانوں نے فتح کیا ہواور کافروں کے قبضہ میں ہی رہنے دیا ہو یا جہاں مسلمان رہتے تھے، پھر کفار نے انھیں وہاں سے جلاوطن کردیا ہو۔

فقہ حنبلی میں ان داروں کی وضاحت یوں کی گئی ہے :

فكل دار غلب عليها أحكام المسلمين فدار الإسلام و إن غلب عليها احكام الكفر فدار الكفر ۔ (۳)

ہر وہ دار جہاں مسلمانوں کے احکام غالب ہوں دارالاسلام ہے اور اگر احکام کفر غالب ہوں وہ تو دارالکفر ہے۔

دارالکفر کی جو تعریف درمختار کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے وہ صاحبین کی رائے کے مطابق ہے، امام صاحب اس میں مزید دو شرطوں کا اضافہ کرتے ہیں؛ چنانچہ بدائع میں ہے :

واختلفوا فی دار الإسلام أنها بماذا تصير دار الكفر ، قال أبو حنيفة: إنها لا تصير دار الكفر إلا بثلاث شرائط ، أحدها : ظهور أحكام الكفر فيها ، والثانی : أن تكون متأخمة لدار الكفر ، والثالث :

---

(۱) حاشیۃ الدسوقی، باب الجہاد۔ (۲) حاشیۃ البجیری علی الغطیب، کتاب احکام الجہاد: ۱۳۹/۵، دارالکتب العلمیۃ، لبنان۔
(۳) الآداب الشرعیہ، ابوعبداللہ محمد بن مفلح المقدسی الحنبلی، فصل فی تحقیق دارالاسلام ودارالحرب: ۲۳۹/۱۔

أن لا يبقى فيها مسلم ولا ذمي آمناً بأمان الأول وهو أمان المسلمين ، وقال أبو يوسف و محمد إنها تصير دار الكفر بظهور أحكام الكفر فيها ۔ (۱)

فقہا کا اس بات میں اختلاف ہے کہ دارالاسلام دارالکفر کب بنتا ہے، امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ دارالاسلام تین شرطوں سے دارالکفر بنے گا، ایک : احکام کفر کا غلبہ، دوسرے : دارالکفر سے اتصال اور تیسرے یہ کہ کوئی مسلمان اور ذمی سابقہ امان کی وجہ سے مامون نہ رہ سکے، امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے نزدیک دارالاسلام احکام کفر کے غلبہ کی وجہ سے دارالکفر بن جائے گا۔

ان تعریفات کو پیش نظر رکھنے سے تین طرح کی باتیں سمجھ میں آتی ہیں :

(۱) دارالاسلام وہ ہے جو مسلمانوں کے زیر قبضہ ہو اور دارالحرب وہ ہے جو کافروں کے زیر قبضہ ہو۔

(۲) دارالاسلام وہ ہے جہاں مسلمان مامون ہوں اور دارالحرب وہ ہے جہاں کفار مامون ہوں، کاسانی کی عبارت کی رُو سے یہ بھی ضروری ہے کہ دارالاسلام میں کفار اور دارالحرب میں مسلمان خوف کی حالت میں ہوں، امام ابوحنیفہؒ کی تقسیم کا مدار اسی خوف و امن کی بنیاد پر ہے۔

(۳) دارالاسلام وہ ہے جہاں احکام اسلام غالب ہوں اور دارالحرب وہ ہے جہاں احکام کفر کو غلبہ حاصل ہو، شامی نے جمعہ وعیدین وغیرہ کے قیام کی اجازت کو اسلامی احکام کے اجراء کی علامت قرار دی ہے، جیسا کہ دسوقی نے اکثر شعائر اسلام کے نفاذ کی بات کہی ہے اور اسلامی احکام کے غلبہ سے بھی یہی مراد ہے۔

مذکورہ بالا تعریفات میں غور کرنے سے فقہاء کے درمیان آراء کا اختلاف نظر آتا ہے، مثلاً حنابلہ کے نزدیک دارالاسلام ہونے کے لئے احکامِ اسلام کا غلبہ ضروری ہے، مالکیہ کا مسلک بھی یہی ہے کہ تمام یا اکثر شعائر اسلام کا نفاذ ضروری ہے، اس سلسلہ میں شوافع نے کافی وسعت سے کام لیا ہے، ان کے نزدیک اگر کسی مسلم مملکت پر کفار کا قبضہ ہو جائے اور مسلمانوں کو وہاں سے جلاوطن کر دیا جائے تو بھی وہ دارالاسلام ہی رہتا ہے، فقہ حنفی میں صاحبین کے نزدیک کفریہ احکام کے غلبہ سے دارالاسلام دارالکفر بن جاتا ہے، جب کہ امام صاحب کے نزدیک مزید دو شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

دارالاسلام اور دارالحرب کی کوئی نپی تلی اور جامع و مانع تعریف کے نہ پائے جانے کی اصل وجہ یہ ہے کہ فقہاء نے اپنے زمانے اور اپنے علاقے کے حالات کو ملحوظ رکھ کر ان دونوں داروں کی وضاحت کی ہے، حضرت الاستاذ مولانا رحمانی نے صاحبین اور امام کے اختلاف کی یہی توجیہ کی ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب السیر: ۶/ ۱۱۲، نیز دیکھئے: شامی، کتاب الجہاد، باب المستأمن: مطلب فیما تصیر بہ دارالاسلام دارحرب: ۶/ ۲۸۸۔

میرا خیال ہے کہ اگر واقعی اصحاب مذہب سے ان اصطلاحات کے بارے میں برہان کے بجائے تغیر زمان کا نتیجہ ہو، اس کا اندازہ اس شرط سے ہوتا ہے جو امام ابوحنیفہؒ نے لگائی ہے کہ دارالحرب ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ دارالاسلام سے اس کا اتصال نہ ہو، گوکہ حضرت الامام کے عہد میں مملکت اسلامی کی دفاعی بالادستی اور عسکری قوت کے تحت یہ بات ناقابل تصور تھی کہ ایک مملکت کافرہ جو اس کے پڑوس میں ہو، خودسری کا ثبوت دے، اس لئے وہ ایسی غیر اسلامی مملکتوں کو بھی دارالحرب کے زمرے میں نہیں رکھتے ہیں، جب کہ صاحبین میں خلافتِ اسلامی کی یہ پوزیشن باقی نہ رہی ہوگی یا ایسے آثار پیدا ہوگئے ہوں گے جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہوں گے کہ آئندہ یہ صورت حال باقی نہ رہ سکے گی، اس لئے انھوں احکام اسلامی اور احکام کفر کے اجراء وغلبہ کو بنیاد بنایا ہوگا۔(۱)

دارالعہد

عام طور پر کتب فقہ میں ان ہی دو داروں کا تذکرہ ملتا ہے؛ لیکن کیا ان دو داروں کے علاوہ کوئی تیسرا دار بھی ہے؟ قرآن کریم کی یہ آیت اس کا جواب ہاں میں دیتی ہے :

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ (الانفال:۷۲)

بے شک جو ایمان لائے، دین کے لئے وطن چھوڑا اور اپنی جان و مال سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) پناہ دی اور مدد کی، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو لوگ ایمان تو لائے مگر (قدرت کے باوجود) ہجرت نہیں کی تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں، تم لوگوں کی ان سے کوئی دوستی نہیں اور اگر وہ دین کے کام میں تم لوگوں سے مدد چاہیں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے؛ مگر ایسی قوم کے مقابلہ میں نہیں جن کا تم سے معاہدہ ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے خوب دیکھ رہے ہیں۔

(۱)　جدید فقہی مسائل: ۴/۶۵۔

اس آیت میں تین طرح کے مسلمانوں کا ذکر ہے، ایک وہ جو ہجرت کر کے دارالاسلام منتقل ہو گئے، دوسرے وہ جنھوں نے ہجرت نہیں کی اور ایسی قوم کے درمیان سکونت اختیار کی جن کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہیں ہے، تیسرے وہ غیر مہاجر مسلمان جن کی رہائش ایسی قوم کے درمیان ہے جن سے مسلمانوں کا معاہدہ ہے، یہ آیت غیر مسلم ملکوں کو دو قسموں میں تقسیم کرتی ہے، محارب اور معاہد، یہ مضمون سورۂ توبہ میں بھی وارد ہوا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۔ (التوبۃ:۴)

مگر ان مشرکین سے جنگ نہ کرو، جن سے تمہارا معاہدہ ہو، پھر وہ تمہارے ساتھ عہد شکنی نہ کریں، اور تمہارے مقابلہ کسی کی مدد نہ کریں تو ان سے مدتِ معاہدہ تک عہد وفا کرو کہ خدا اہل تقویٰ کو پسند کرتا ہے۔

مدنی دور میں بھی ہمیں اس تیسرے دار کی مثال ملتی ہے؛ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد سے فتح مکہ تک مکہ کا علاقہ معاہد دار کی حیثیت کا حامل تھا، صلح حدیبیہ سے پہلے مکہ خالصتاً دارالحرب تھا کہ وہاں سے ہجرت فرض تھی اور فتح کے بعد مکہ خالصتاً دارالاسلام بن گیا اور یہ اعلان کر دیا گیا: ''لا هجرة بعد الفتح'' (۱) ''فتح مکہ کے بعد ہجرت کا حکم باقی نہیں رہا''۔

یہ وہی دار ہے جس کو فقہاء نے ''دارالعہد، یا دارالموادعۃ'' یا ''دارالصلح'' سے تعبیر کیا ہے؛ چنانچہ موسوعۃ فقہیہ میں ہے :

دارالعهد : وتسمى دارالموادعة و دارالصلح وهي : كل ناحية صالح المسلمون أهلها بترك القتال على أن نكون الأرض لأهلها ۔ (۲)

دارالعہد جسے دارالموادعہ اور دارالصلح بھی کہا جاتا ہے، وہ علاقہ ہے جس کے باشندگان سے مسلمانوں نے ناجنگ معاہدہ کیا ہو اس شرط پر کہ زمین کفار کے ہی زیر قبضہ رہے گی۔

فقہ حنفی میں اس دار کو ''دارالموادعۃ'' کے نام سے معنون کیا گیا ہے، بدائع الصنائع کی عبارت ہے :

---

(۱) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۸۳۔ (۲) الموسوعۃ الفقہیۃ: ۲۰۱/۲۰۔

لو دخل فی دار الموادعة رجل من غیر دارھم بأمان ثم خرج إلی دارالاسلام بغیر أمان فھو اٰمن ؛ لأنه لما دخل دارالموادعین بأمانھم صار کواحد من جملتھم فلو عاد إلی داره ثم دخل دارالاسلام بغیر أمان کان فیئاً ۔ (۱)

اگر دارالمواعہ میں کوئی ایسا شخص امان کے ذریعہ آئے جو کسی اور دار(مملکت) سے تعلق رکھتا ہو، پھر وہ دارالاسلام میں بغیر امان کے داخل ہوتو وہ مامون ہوگا (اسے نئے سرے سے امان حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی)؛ کیوں کہ جب وہ دارالموادعہ میں امان کے ساتھ داخل ہوا تو وہ انھیں میں کا ایک فرد ہوگیا، ہاں اگر وہ اپنی مملکت میں واپس چلا جائے تو دارالاسلام میں امان کے بغیر داخل ہوتو وہ مامون نہ ہوگا۔

فقہ شافعی میں دارالعہد یا دارالصلح کے لفظ سے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے، ماوردی کا بیان ہے :

والثانی ما صولحوا علی أنھا أی الأرض لھم ولنا الخراج عنھا فھو أی مایواخذ من خراجھا کجزیة ، إن أسلموا سقط عنھم أو انتقلت الأرض إلی مسلم سقط عنھم کسقوط جزیة بإسلام ، وإن انتقلت إلی ذمی من غیر أھل الصلح لم یسقط خراجھا ، وتسمی ھذہ دار عھد ، وھی ملک لھم لا یمنعون فیھا إحداث کنیسة ولا بیعة لھا کما یأتی ، ویقرون فیھا بلا جزیة ؛ کما فی الاقناع ۔ (۲)

اور دوسری قسم کی زمین وہ ہے جس کی بابت کفار سے معاہدہ کیا گیا ہو کہ زمین ان کے زیر قبضہ رہے گی اور وہ ہمیں اس کا خراج ادا کریں گے، اس خراج کی حیثیت جزیہ کی ہوگی، اگر وہ اسلام قبول کرلیں یا یہ زمین کسی مسلمان کی طرف منتقل ہوجائے تو ان سے خراج ساقط ہوجائے گا، جیسا اسلام لانے سے جزیہ ساقط ہوجاتا ہے اور اگر وہ زمین کسی دوسرے ذمی کی طرف منتقل ہوجائے، جس کا تعلق معاہدہ سے نہ ہوتو اس کا خراج ساقط نہ ہوگا اور ایسے دار کو دار عہد کہا جاتا ہے، یہ دار کفار کے زیر ملکیت ہوگا، انھیں کنیسہ وکلیسا بنانے کی آزادی حاصل ہوگی اور جزیہ کے بغیر رہنے کی اجازت ہوگی۔

اس دار کو دارالاسلام نہیں کہا جاسکتا؛ کیوں کہ یہاں کے لوگ احکام اسلام کے پابند نہیں ہیں، شرح السیر الکبیر میں ہے :

(۱) بدائع، کتاب السیر: ۶/۱۰۷۔ (۲) شرح منتھی الارادات، کتاب الجھاد، باب الارضون المغنومة: ۴/۲۰۴۔

لو قتل رجل من المواد عين رجلاً منهم فی دار المو ادعة لم يكن عليه القصاص ، ولو قتل المستأمن مستأمناً فی دارنا يجب عليه القصاص ؛ لأن أهل دار المو ادعة ما ألزموا شيئاً من حكم الإسلام فإنهم وادعونا على ألا تجری عليهم أحكامنا ، فكانت على حالها ، والقتل فی دار الحرب ليس بموجب للقصاص . فأما المستأمنون فهم فی دار الإسلام وحكم الإسلام يجری عليهم ، ماداموا فی دارنا فيما فيه حق العباد والقصاص بهذه الصفة ۔ (۱)

اگر دارالموادعۃ (معاہد قوم) کا کوئی فرد اپنے ہی قوم کے کسی فرد کی جان لے لے تو اس کا قصاص نہیں لیا جائے گا، اس کے برعکس اگر کوئی متامن کسی متامن کو دارالاسلام میں قتل کردے تو اس پر قصاص واجب ہوگا؛ کیوں کہ دارالمواعہ کے باشندے احکام اسلام کے پابند نہیں ہیں، اس وجہ سے کہ انھوں نے ہم سے اس بات پر معاہدہ کیا ہے کہ ہمارے احکام ان پر جاری نہیں ہوں گے؛ لہٰذا ان کا ملک علی حالہ دارالحرب ہی رہے گا اور دارالحرب میں قتل کرنا قصاص کا موجب نہیں ہے، بہرحال متامن تو وہ دارالاسلام کے احاطہ میں ہیں اور جب تک وہ دارالاسلام میں رہیں حقوق العباد سے متعلق ان پر جاری ہوں گے اور قصاص کا تعلق بھی حقوق العباد سے ہے۔

اور نہ ہی یہ دار خالصتاً دارالحرب ہے؛ کیوں کہ ان کی جان ومال، عزت وآبرو محفوظ ہے، وہ امان کے بغیر مسلم مملکت میں آسکتے ہیں، انھوں نے اگر کسی کو امان دی تو دارالاسلام کو اس کی پاسداری ضروری ہے، برخلاف دارالحرب کے کہ اس کے احکام ان جیسے مسائل میں مختلف ہیں؛ چنانچہ شرح السیر الکبیر میں ہے :

● و لوكان خرج إلينا رجل من دار غير المواد عين إلى دار المواد عين بأمان ثم خرج الينا بغير أمان لم يكن لنا عليه سبيل ؛ لأنه لما حصل آمنا فی دار المو ادعة فقد التحقق بأهلها ومن هو من أهل دار المواعة يكون اٰمنا فينا ... وكذلک لوكان أهل داره مواد عين لأهل دار موادعينا ۔ (۲)

کسی ایسے ملک کا فرد جن سے ہمارا معاہدہ نہیں ہے اگر امان لے کر ہمارے معاہد ملک میں آئے پھر امان کے بغیر وہ ہمارے ملک میں آئے تو (وہ مامون رہے گا) اس کے

(۱) شرح السیر الکبیر، باب مایجب من النصرۃ:۵/ ۱۱۲۔ (۲) شرح السیر الکبیر، باب الموادعۃ:۵/ ۱۰۔

خلاف ہمیں کچھ حق حاصل نہ ہوگا؛ کیوں کہ جب اس نے دارالمواعۃ میں امان حاصل کرلی تو وہ دارالمواعۃ کا ایک فرد ہوگیا اور چوں کہ دارالمواعۃ کا ہر فرد مامون ہے (اس لئے وہ بھی مامون رہے گا) یہی حکم اس صورت میں بھی ہے، جب اس شخص کی مملکت کا ہماری معاہد مملکت کے ساتھ معاہدہ ہو (کہ اس معاہدہ کی پاسداری ہم پر بھی ضروری ہوگی)۔

● ولو كان رجل من أهل دارالمواعة تزوج امرأة من أهل الدار الأخرى، فولدت أولاداً بغير أمان، لم يكن للمسلمين عليها ولا على أولادها سبيل؛ لأنها صارت من أهل دار الموادعة تبعاً لزوجها۔ (۱)

معاہد مملکت کے کسی فرد نے اگر غیر معاہد مملکت کی کسی عورت سے شادی کی، پھر اس عورت کے یہاں اولاد ہوئی اس حال میں کہ اس نے اسلامی مملکت سے امان حاصل نہیں کی ہے تو بھی وہ عورت اور اس کے لڑکے مامون رہیں گے؛ کیوں کہ شوہر کی وجہ سے تبعاً وہ بھی معاہد مملکت کی شہری بن گئی۔

● ولو خرج قوم من الموادعين إلى بلدة أخرى ليست بينهم وبين المسلمين موادعة، فغزا المسلمون تلك البلدة، فهؤلاء آمنون لا سبيل لأحد عليهم۔ (۲)

اگر معاہد مملکت کے افراد کسی غیر معاہد مملکت میں داخل ہوں، پھر مسلمان اس غیر معاہد مملکت پر حملہ کردیں تو معاہد مملکت کے یہ لوگ مامون سمجھے جائیں گے، ان کے خلاف کچھ کرنے کا کسی کو حق نہ ہوگا۔

مذکورہ بالا احکام جو دارالموادعۃ اور دارالحرب کے درمیان مختلف ہیں، مسئلہ امان سے تعلق رکھتے ہیں؛ لیکن امان کے علاوہ ہجرت کے مسئلہ میں بھی دونوں داروں کا حکم مختلف ہے؛ چنانچہ صلح حدیبیہ سے پہلے مکہ کے مسلمان پر ہجرت فرض تھی؛ لیکن حدیبیہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اگر کوئی مسلمان ہجرت کر کے مدینہ آئے تو اسے واپس مکہ بھیج دیا جائے گا، آپ ﷺ نے مصلحت کے پیش نظر اس دفعہ کو منظور فرمالیا، اس سے معلوم ہوا کہ کسی مملکت کے ساتھ کئے گئے معاہدہ میں اگر ایسی کوئی دفعہ بھی شامل ہو اور اسے مصلحتاً قبول کرلیا گیا ہو تو اس معاہد مملکت کے مسلمانوں پر ہجرت فرض نہیں رہے گی۔

دارالمواعۃ اور دارالحرب کے درمیان احکام کا یہ اختلاف اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ دارالموادعۃ کو خالصتاً دارالحرب قرار دیا جائے، ماوردی نے تو دوٹوک الفاظ میں دارالعہد کو مستقل تیسری قسم قرار دی ہے، ان کے الفاظ ہیں :

(۱) شرح السیر الکبیر، باب الموادعۃ: ۵/۱۱۔ (۲) بدائع الصنائع، کتاب السیر: ۶/۶۷۔

فھی دار عھد ، ولیست دار إسلام ولا دار حرب ۔ (۱)

(ایسا ملک) دارالعہد ہے، نہ کہ دارالاسلام اور دارالحرب ۔

لیکن خیال ہوتا ہے کہ جس طرح اس کو خالصتاً دارالحرب قرار دینا صحیح نہیں ہے، اس طرح اس کو مستقلاً ایک تیسری قسم قرار دینا بھی مناسب نہیں ہے؛ بلکہ یہ دارالکفر کی ہی ایک ذیلی قسم پر قائم ہے، یعنی وہ غیر مسلم مملکت جس کا مسلم مملکت کے ساتھ ناجنگ معاہدہ ہو اور وہ اس معاہدہ پر قائم ہو، ایسا نہ ہو کہ یہ معاہدہ محض فائل کی زینت ہو اور حقیقت میں سرحدیں گولیوں اور دھماکوں کی آواز سے گونج رہی ہوں ۔

دارالأمن — بحث ونظر کا ایک اہم پہلو

دارالاسلام اور دارالکفر کی جو تقسیم کتب فقہ میں مذکور ہے، یہ قطعی نہیں؛ بلکہ اجتہادی ہے، دار کی اس تقسیم اور پھر ان کی تعریف میں زمانہ وحالات کا بڑا دخل ہے، جس زمانے میں فقہاء نے دارالاسلام اور دارالحرب کی یہ بحثیں کی ہیں، اس زمانے میں نظامِ حکومت دیگر نظام ہائے زندگی کی طرح سادہ تھا، عالمی سطح پر صورتِ حال یہ تھی کہ یا تو وہ مملکتیں تھیں جہاں اسلام کا غلبہ ہو یا وہ مملکتیں تھیں جہاں کفر کا غلبہ ہو، پہلی قسم کی مملکتیں دارالاسلام اور دوسری قسم کی دارالحرب کہلائیں، اس وقت کوئی ایسا بین الاقوامی قانون نہیں تھا، جو مملکت کی خارجی دست درازیاں قابو میں کر سکے، بین الاقوامی تعلقات کے کوئی ایسے اُصول نہیں تھے، جن کی مملکتیں پابند ہوں، ملکی سطح پر ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے لئے مملکتِ اسلامیہ کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے، پوری دنیا کے مسلمان ایک قوم سمجھے جاتے تھے، غیر مسلم مملکتوں کے شہری بن کر رہنے کا نہ رواج تھا اور نہ مسلمانوں کا ایسا مزاج تھا، مسلمانوں کی آبادی کا اکثر حصہ دارالاسلام میں رہائش پذیر تھا، دارالحرب کا نظام حکومت شاہی تھا، جس میں مسلمان تو درکنار غیر مسلم عوام بھی حصہ دار نہیں بن سکتے تھے، بادشاہ کے جی میں جو آیا وہ کرتا، مسلمانوں کو نہ ظلم کے خلاف احتجاج کا حق تھا اور نہ مطالبات منوانے اور حقوق حاصل کرنے کے لئے کسی تنظیم کے بنانے کا تصور ۔

لیکن ادھر گذشتہ دوصدی سے حالات میں کافی تبدیلی رونما ہوئی، انقلابِ فرانس کے بعد نظام حکومت نے اپنے پیرہن بدلے، ڈیموکریسی کے پنجۂ اقتدار نے فریسیوں کی خوگر بادشاہت کا گلا گھونٹا، سیکولرزم نے بال و پر پھیلا کر فلک پیمائیاں شروع کیں، مغربی استعمار نے دین بیزاری وسیکولرزم کی ایسی تخم ریزی کی کہ اس کے برگ وبار نے ایوانِ اقتدار کے بشمول زندگی کے ہر شعبہ کو اپنی لپیٹ میں لیا، اسلامی مملکت کے دستور اساسی میں موجود نفاذ شریعت سے متعلق دفعات پر خط نسخ کھینچا گیا اور ایسا کیوں نہ ہو کہ استعمار کے سہارے ''دل کے مئے خانے سے مغرب نے کر ڈالے خموش''، قومیت کے زہر ہلاہل نے عالم اسلام کے رگ وپے میں اس طرح سرایت کیا کہ اپنوں نے اپنوں کے لئے

(۱) الحاوی الکبیر، کتاب السیر، باب فتح السواد، القسم الخامس: ۱۴/۲۶۷، دارالکتب العلمیہ، بیروت، لبنان ۔

دروازے بند کئے، ہجرت کرنا جو کبھی مسائل کا حل تھا وہ اب مسائل کا مقدمہ بنا، غیر مسلم مملکت کے مہاجر مسلمانوں کے لئے مسلم مملکت کی شہریت حاصل کرنا کوئی آسان کام نہ رہا، اِدھر غیر مسلم مملکتوں نے جب جمہوریت وسیکولرزم کا لبادہ خوش رنگ زیب تن کیا تو ان کے اندرون نے بھی کروٹ لی اور بیرون نے بھی تغیر پذیری قبول کی، اندرون یوں بدلا کہ سیکولرزم نے مذہبی اقتدار کی بیخ کنی کی، اکثریتی فرقے کے غیر مسلم مذہبی شدت پسندوں کو لال جھنڈی دکھائی، جس کے نتیجہ میں غیر مسلم مملکت کی مذہبی اجارہ داری رخت سفر باندھنے پر مجبور ہوئی، یقیناً مسلم مملکتوں میں سیکولرزم کی لعنت نے اسلام کو کافی و ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے؛ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غیر مسلم مملکتوں میں اس کی آمد مسلمانوں کے لئے بہت حد تک خوش کن رہی؛ کیوں کہ حکومت کا سرے سے کوئی مذہب نہ ہونا یا برائے نام ہونا اس بات سے بہتر ہے کہ حکومت کسی کفریہ مذہب کو نافذ کرے اور غیر مسلم سیکولر سربراہان حکومت کا مذہبی تعصب سے خالی ہونا اس بات سے بہتر ہے کہ مذہبی حکومت ہو اور یہ سربراہان عصبیت کے نشہ میں مخمور ہوکر مسلمانوں کے خلاف ظلم وستم روا رکھیں، ایک طرف سیکولرزم نے ایوانِ اقتدار میں مذہبی اجارہ داری کی کمر توڑی تو دوسری طرف جمہوریت نے بہ آواز بلند یہ ندا لگائی کہ حکومت وسلطنت کسی خاص مذہب یا کسی خاص خاندان یا کسی خاص قوم کی جاگیر نہیں ہے؛ بلکہ یہ مملکت کے عوام کا حق ہے، مملکت کے سارے شہری قانون کی نگاہ میں برابر ہیں، سب کو مذہبی معاملات میں آزادی حاصل ہے اور مذہب کی تبلیغ واشاعت کی بھی اجازت ہے، ہر ایک کو تحفظ فراہم کرنا حکومت کی آئینی ذمہ داری ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج کے اکثر دارالحرب کل کے دارالحرب سے مختلف ہوگئے، کل کے دارالحرب میں اگر ظلم وستم کے خلاف ''جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیر لبی رہی'' تو موجودہ دارالحرب میں مسلمان قائد ایوان میں کھڑا ہوکر مسلم دشمن سرغنوں سے آنکھوں میں آنکھیں ملا کر خطاب کرتا ہے، کل کے دارالحرب میں ایوانِ حکومت میں اپنا احتجاج درج کرانے کے لئے مسلمانوں کے سامنے ''راستے بند تھے سب کوچۂ قاتل کے سوا'' جب کہ موجودہ دارالحرب میں مسلمان مقننہ میں بیٹھ کر مملکت کی قانون سازی میں حصہ لے رہے ہیں، کل کے دارالحرب میں آئینی طور پر مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل نہیں تھی، ان کے حقوق محفوظ نہیں تھے، ان کے تحفظ کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی، جب کہ آج حالات اس کے برعکس ہیں، کل کے دارالحرب میں دستورِ زباں بندی کی وجہ سے بادشاہ کے خلاف زبان کھولنا موت کو پکارنا تھا؛ لیکن آج کے دارالحرب میں حکومت کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے کی قانوناً اجازت ہے، ہاں! آج بھی بعض دارالحرب ایسے ہیں جہاں اسلامی نقطۂ نظر سے صورت حال بہت سنگین ہے اور مسلمان ناگفتہ بہ حالات سے گذر رہے ہیں، ایسے استثنائی ممالک کتبِ فقہ میں مذکور دارالحرب کے عین مصداق ہیں؛ لیکن اکثر دارالحرب کی صورتِ حال ایسی نہیں ہے۔

قومی وبین الاقوامی حالات کی تبدیلیوں اور نظام مملکت کی پیچیدگیوں کی بنا پر موجودہ دور میں دارالحرب کی

ایک ذیلی تقسیم ناگزیر ہے، موجودہ دور میں دارالحرب ودارالاسلام کی تقسیم کی بابت علماء ودانشوران ملت کے تین طبقے پائے جاتے ہیں، ایک طبقہ وہ ہے جس کے نزدیک یہ تقسیم اپنی حقیقت واہمیت کھوچکی؛ لہٰذا اسے تاریخ کا ایک حصہ بن جانا چاہئے ، دوسرا طبقہ آئین نو سے ڈرنا ،طرزِ کہن پہ اڑنا کا مصداق ہے ،فقہاء کے دارالحرب کے احکام موجودہ دارالحرب پر ہوبہو منطبق کرتا ہے اور دار کی کسی تیسری یا ذیلی قسم کو قبول نہیں کرتا اور تیسرا طبقہ وہ ہے جو راہِ اعتدال پر گامزن ہے، یہ فقہاء کی ذکر کردہ تقسیم کی اہمیت بھی تسلیم کرتا ہے اور ایک نئی تقسیم کی ضرورت بھی محسوس کرتا ہے۔

کتبِ فقہ میں دارالاسلام اور دارالحرب یا زیادہ سے زیادہ دارالعہد کا تصور ملتا ہے، ان کے علاوہ کسی ایسے دار کا تذکرہ نہیں ہے جو موجودہ تبدیلیوں کے تقاضے پورا کرتا نظر آئے ، سیرت نبوی کے مطالعے سے ہمیں ایک ایسی مثال ملتی ہے جو ایک نئے دار کا تصور پیش کرتی ہے ، یہ مثال ہجرتِ حبشہ کی ہے، مکی دور میں مسلمانوں کو کافی مشکلات کا سامنا تھا، انھیں طرح طرح سے ستایا جاتا تھا، ناقابل برداشت اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں اور دین پر عمل کرنا بہت ہی دشوار تھا، ایسے حالات میں صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کی ایما پر ملکِ حبشہ ہجرت کی، حبشہ بھی اس وقت دارالکفر (غیر مسلم ملک) تھا؛ لیکن وہاں مسلمانوں کو امن حاصل تھا، نجاشی کی حکومت ان کی محافظ اور حامی تھی ، انھیں مذہبی آزادی حاصل تھی ، اور دینی احکام پر عمل کرنے میں کوئی پابندی نہیں تھی ، ہجرت حبشہ کا واقعہ مدینہ کے دارالہجرت بننے سے بہت پہلے کا ہے، مدینہ کے دارالہجرت بن جانے کے بعد بھی بعض صحابہ ایک زمانے تک حبشہ میں ہی رہائش پذیر رہے، حبشہ کا یہ ملک خالصتاً دارالحرب نہیں تھا؛ بلکہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے الفاظ میں ''دارامان'' تھا، شیخ فرماتے ہیں :

> وہجرت دراسلام بردووجہ وقاع شدہ ،اول: انتقال از دارخوف بہ دارامان؛ چنانچہ بعض صحابہ درابتدائے اسلام بہ حبشہ ہجرت کردند، تاازخوف شر وفساد مشرکان مکہ درامان باشد، وچناں کہ بعض ازمکہ بہ مدینہ رفتند پیش ازہجرت رسول اللہ ﷺ واستقرار امر اسلام، وثانی: انتقال از دارکفر بہ دار اسلام وایں بعد از تمکن واستقرار آنحضرت ﷺ بود درمدینہ۔(۱)
>
> اسلام میں ہجرت دو طرح ہوئی ہے، ایک تو دار خوف سے دار امان کی طرف منتقل ہوکر جیسا کہ بعض صحابہ نے ابتدائے اسلام میں حبشہ کی طرف ہجرت کی ؛ تاکہ مکہ کے مشرکوں کے شر وفساد سے مامون ہوجائیں ، یا جیسے بعض صحابہ کرام آنحضرت ﷺ کے ہجرت فرمانے اور احکام اسلام کے استقرار سے پہلے مدینہ گئے ، ہجرت کی دوسری قسم دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف منتقل ہونا ہے اور یہ اس وقت ہوئی جب مدینہ میں آنحضرت ﷺ کا اقتدار قائم ہوگیا۔

معاصر علماء نے حبشہ کی ایسی مثال کے پیش نظر غیر مسلم مملکتوں کی ایک قسم ''دارالامن'' کے نام سے کی ہے، یعنی

(۱) اشعۃ اللمعات: ۱/ ۳۵، حدیث انما الاعمال۔

وہ غیر مسلم مملکتیں جہاں مسلمانوں کو مذہبی آزادی، امن وامان اور بنیادی حقوق حاصل ہوں؛ چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی رقم فرماتے ہیں :

اور دار الکفر کی دوسری قسم وہ ہے جہاں اگر چہ حکومت تو غیر مسلموں کی ہے؛ لیکن وہاں مسلمان اپنے دینی شعائر قائم رکھنے میں آزاد ہوں اور حکومت کی طرف سے ان پر اپنے دینی احکام پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، ایسی جگہ کو ''دارالامن'' کہا جاتا ہے، ابتداء اسلام میں اس کی مثال ''حبشہ'' تھا۔(۱)

حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں :

حبش میں اقتدار کی باگ گو عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی ، مگر مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل تھی ، فقہاء نے عام طور پر اس نظام مملکت سے تعرض نہیں کیا ہے اور اس پر زیادہ بحث نہیں کی ہے، شاید ایسا اس لئے ہوا کہ ہجرت کے واجب ہونے کی وجہ سے بعد کے ادوار میں غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں نے آباد ہونے سے گریز کیا اور اس وقت فقہاء کو اس پہلو پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ؛ لیکن موجودہ حالات میں سیرت کا یہ گوشہ علماء کی خاص توجہ کا طالب ہے، غالباً اس نظیر کو سامنے رکھ کر ماضی قریب کے علماء نے دار کی ایک نئی صورت ''دارالامن'' کا اختراع کیا ہے...... ''دارالامن'' وہ ملک ہے جہاں کلید اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو؛ لیکن مسلمان مامون ہوں ، مسلمان دعوتِ دین کا فریضہ انجام دے سکتے ہوں، اور ان اسلامی احکام پر جن کے نفاذ کے لئے اقتدار ضروری نہ ہو، عمل کر سکتے ہوں، اگر ملک کا کوئی غیر مسلم باشندہ کسی مسلمان پر شخصی طور پر تعدی کرے تو یہ اس کے دارالامن رہنے کے منافی نہیں۔(۲)

استاذ گرامی مفتی سعید احمد پالن پوری مدظلہ العالی رقم فرماتے ہیں :

......دار الکفر کی چار قسمیں ہیں: (۱) دار المحاربہ یا دار الحرب: جیسے صلح حدیبیہ سے پہلے مکہ، (۲) دار المعاہدہ والمسالمہ: جیسے صلح حدیبیہ کے بعد مکہ، (۳) دار الامن: جیسے حبشہ، (۴) دار الشر والفساد: جیسے ہجرت سے پہلے مکہ۔(۳)

فقہاء نے دار العہد کی جو تقسیم کی ہے، اس کا پس منظر دار الکفر کی خارجی امن پالیسی ہے اور معاصر علماء نے دارالامن کی جو جدید تقسیم کی ہے وہ دار الکفر کی داخلی امن پالیسی کے پیش نظر ہے؛ لہٰذا وہ تمام مملکتیں جن کا دارالاسلام کے ساتھ نا جنگ معاہدہ ہو دار العہد کہلائیں گی اور وہ تمام غیر مسلم مملکتیں جہاں مسلم شہریوں کو امن وامان فراہم ہو

(۱) اسلام اور سیاسی نظریات: ۳۲۸۔ (۲) جدید فقہی مسائل: ۴/ ۷۲-۷۳۔ (۳) اسلام تغیر پذیر دنیا میں: ۲۶۔

دارالامن کہلائیں گی اور جہاں مسلم شہریوں کو امن وامان فراہم نہ ہو اور مذہب پر عمل کرنا دشوار ہو، وہ خالصتاً دارالحرب کہلائیں گی، دارالامن اور دارالعہد دونوں کی حیثیتیں مختلف ہیں، اس لئے ایک ہی ملک کا دارالعہد اور دارالامن دونوں ہونا ممکن ہے، اس تفصیل کی روشنی میں موجودہ دور کی غیر مسلم مملکتوں کی فقہی پوزیشن متعین کی جاسکتی ہے۔

خارجِ اسلام صدرِ مملکت ہو یا وضعی قوانین نافذ ہوں تو دار کا حکم

اصل تو یہ ہے کہ مسلمانوں کا سربراہ اسلام پر اعتقاد رکھتا ہو اور قانون سازی کا ماخذ شریعتِ اسلامیہ ہو، گذشتہ دور میں دارالاسلام کی صورتِ حال یہی تھی، اس دور میں اس بات کا تصور مشکل تھا کہ کوئی مملکت مسلمانوں کے زیر تسلط ہو اور وہاں اسلامی احکام نافذ نہ ہوں؛ چہ جائے کہ مسلمانوں کا سربراہ خارجِ اسلام طبقہ سے تعلق رکھتا ہو؛ لیکن وائے حسرت کہ موجودہ دور کی اکثر مسلم مملکتوں میں اسلام کا مکمل نفاذ حکمرانوں کی توجہ کا منتظر ہے اور بعض مسلم مملکتوں کی تو صورتِ حال یہ ہے کہ وہاں کے صدر مملکت خارج اسلام طبقہ سے وابستگی رکھتے ہیں، ایسے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا موجودہ دور کی مسلم مملکتیں دارالاسلام کہلائی جاسکتی ہیں؟ یہ ایک جدید مسئلہ ہے، کتبِ فقہ میں اس کو صراحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے؛ لیکن سرخسی اور شامی کی بعض عبارتوں سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہیں؛ چنانچہ علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں :

> فإن دار الإسلام اسم للموضع الذی یکون تحت ید المسلمین ۔ (۱)
> بے شک دارالاسلام اس جگہ کا نام ہے جو مسلمانوں کے قبضہ میں ہو۔

یعنی کسی علاقہ کے دارالاسلام ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ علاقہ مسلمانوں کے زیر تسلط ہو، قطع نظر اس سے کہ صدر مملکت صحیح معنوں میں مسلمان ہے یا نہیں یا احکام شریعت کا مکمل نفاذ ہے یا نہیں، علامہ شامیؒ کی عبارت اس کو مزید واضح کرتی ہے، وہ فرماتے ہیں :

> لو أجریت أحکام المسلمین و أحکام أھل الشرک لا تکون دار حرب ۔ (۲)
> اگر مسلمانوں کے احکام بھی نافذ ہوں اور اہل شرک کے احکام بھی تو پھر یہ دارالحرب نہ ہوگا۔

موجودہ دور کے مسلم ملکوں کا یہی حال ہے کہ احکام اسلام کے ساتھ احکامِ شرک بھی نافذ ہیں؛ لیکن چوں کہ مملکت پر مسلمانوں کا تسلط ہے اور سربراہان کے لئے یہ بات ممکن ہے کہ وہ احکام شریعت نافذ کریں یا عوام اس بات پر

(۱) شرح السیر الکبیر: ۸۶/۴، باب: ۱۲۷۔ (۲) ردالمحتار علی الدر المختار: ۸۸/۶۔

قادر ہیں کہ وہ ووٹ کی طاقت کے ذریعہ اسلام پسند یا کم از کم اسلام پر اعتقاد رکھنے والے صدر مملکت منتخب کریں؛ اس لئے مملکت دارالاسلام کے حکم سے خارج نہیں ہوگی، علامہ شامیؒ کے دور میں مملکت شام کے بعض علاقوں کا یہی حال تھا کہ نہ وہاں کے حکام مسلمان تھے اور نہ قوانین شریعت کے موافق تھے؛ لیکن اس کے باوجود اس علاقہ پر مسلمانوں کے تسلط کی وجہ سے علامہ شامی نے اس کو دارالاسلام کے حکم میں رکھا، وہ فرماتے ہیں :

> و بهذا ظهر أن ما فى الشام من جبل تيم الله المسمى بجبل الدروز وبعض البلاد التابعة له كلها دار اسلام ؛ لأنها و إن كانت لها حكام دروز أونصارى ، ولهم قضاة على دينهم ، وبعضهم يعلنون بشتم الإسلام والمسلمين ؛ لكنهم تحت حكم ولاة أمورنا ، وبلاد الإسلام محيطة ببلادهم من كل جانب ، و إذا أراد ولى الأمر تنفيذ أحكامنا فيهم نفذها۔ (۱)
>
> اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ شام میں جو جبل یتم اللہ کا علاقہ ہے جس کا نام ''جبل الدروز'' بھی ہے، وہ اور اس کے تابع جو شہر ہیں وہ سب دارالاسلام ہیں؛ کیوں کہ اگر چہ ان علاقوں میں عیسائی اور دروزی حکام موجود ہیں، اور ان میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو علانیہ اسلام اور مسلمانوں کو برا بھلا کہتے ہیں؛ لیکن وہ ہمارے حکام کے ماتحت ہیں اور اسلامی ممالک ہر طرف سے ان کو گھیرے ہوئے ہیں اور اگر ولی الامر ان پر ہمارے احکام نافذ کرنا چاہے تو نافذ کر سکتا ہے۔

یعنی کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لئے یہ اصل ہے کہ اس ملک پر کفار کا قبضہ نہ ہو؛ بلکہ مکمل طور پر مسلمانوں کا غلبہ وقبضہ ہو۔

• • •

(۱) ردعلی الدر، کتاب الجہاد، فصل فی استمان: ۲۸۸/۶۔

علامہ شبلی نعمانیؒ کی ''الغـــزالی'' کا تنقیدی مطالعہ (۱)

مولانا عبید اختر رحمانی ☆

علامہ شبلی نعمانیؒ (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کی شخصیت اور خدمات محتاج تعارف نہیں، آپ نے انیسویں صدی میں اُردو زبان میں تحقیق کی نہ صرف طرح ڈالی؛ بلکہ اس کا نمونہ بھی پیش کیا اور بتایا کہ تحقیق کا معیار کیا اور کیسا ہونا چاہئے، تاریخ وسوانح علامہ شبلی نعمانی کے خاص موضوع رہے ہیں، یہی وجہ ہے سوانح پر ان کی متعدد بیش قیمت تصنیفات ہیں، جیسے ''الغزالی، رومی، الفاروق، المامون'' اور سب سے آخر میں؛ لیکن سب سے بیش قیمت ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم''۔

علامہ شبلی نعمانی کی ایک بیش قیمت تصنیف ''الغزالی'' ہے، یہ امام غزالی کی حیات وخدمات اور افکار کے جائزہ پر ہے، امام غزالی پر علاحدہ سے لکھنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا؛ لیکن جب ''الکلام'' کی تصنیف کے دوران امام غزالی کی کلامی خدمات پر خاصا مواد جمع ہو گیا تو انھوں نے اسے علاحدہ تصنیف کے طور پر شائع کر دیا، علامہ شبلی نعمانی ''الغزالی'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :

> علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتم بالشان علم اور ان کا سرمایۂ ناز ہے، میں آج کل اس کی نہایت مبسوط تاریخ لکھ رہا ہوں، اور اس کے چار حصے قرار دیئے ہیں: (۱) علم کلام کی ابتدا، اس کی مختلف شاخیں، عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں، (۲) علم کلام نے اثبات عقائد اور ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا اور کس حد تک کامیابی حاصل کی؟ (۳) ائمہ علم کلام کی سوانح عمریاں، (۴) جدید علم کلام۔
>
> پہلا حصہ بقدر معتد بہ لکھا جا چکا تھا کہ بوجوہ چند رُک گیا، اور تیسرا حصہ شروع ہو گیا، اس حصے میں امام غزالی کی سوانح عمری شروع ہوئی تو بڑھتے بڑھتے ایک مستقل کتاب بن گئی؛ چوں کہ پوری کتاب کی طیاری کو عرصہ درکار تھا، مناسب معلوم ہوا کہ بلا انتظار باقی یہ حصہ الگ شائع کر دیا جائے۔(۱)

☆ نگراں شعبۂ تحقیق: المعہد العـالی الاسـلامی حیدرآباد۔

(۱) الغزالی، شبلی نعمانی، ط:1902، نامی پریس کانپور۔

راقم نے اولاً الغزالی کا مطالعہ کیا، بعدازاں امام غزالی کے حالات وسوانح میں لکھی گئی دیگر کتابوں کا مطالعہ کیا تو راقم الحروف کو ''الغزالی'' کے بعد مندرجات غلط نظر آئے، یا بعض چیزیں ایسی نظر آئیں، جن کو امام غزالی کی سوانح میں ہونا چاہئے ؛لیکن یہ اس سے خالی ہے، اسی استدراک اور تنقیدی مطالعہ پر مشتمل یہ مضمون اہل علم کی خدمت میں حاضر ہے، علامہ شبلی نعمانیؒ نے متعدد مرتبہ آزاد تنقید کی حمایت کی ہے اور شخصیت پرستی میں مبتلا ہونے سے منع کیا ہے؛ لہٰذا یہ ان ہی کی نصیحت پر عمل ہے۔

الغزالی کا قدیم ترین نسخہ جس تک میری رسائی ہوئی، وہ ۱۹۰۲ عیسوی کا نامی پریس، کانپور کا ہے، (۱) اور اسی اس کتاب کے آخر میں جہاں علامہ شبلی نعمانی کے دستخط ہیں، وہاں پر تاریخ دسمبر ۱۹۰۱ء کی ہے، گویا علامہ اس کتاب سے ۱۹۰۱ء کے آخر میں فارغ ہوئے اور ۱۹۰۲ء میں علامہ شبلی نعمانی کے حین حیات یہ کتاب شائع ہوئی، علامہ شبلی نعمانی کی عبارتوں کے اقتباس میں نے اسی سے لئے ہیں۔

واضح رہے کہ ''الغزالی'' کی تصنیف سے قبل علامہ شبلی نعمانی ''سیرت النعمان''، ''المامون'' اور ''الفاروق'' جیسی عظیم کتابوں سے اُردو زبان کو گراں بار کر چکے تھے؛ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ جس وقت انھوں نے ''الغزالی'' کی تصنیف کی، وہ ان کے علمی اوج کمال کا دور تھا۔

علامہ شبلی نعمانیؒ امام غزالیؒ کی سوانح کے مصدر وماخذ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> امام غزالی کی سوانح عمری میں کوئی مستقل کتاب تو غالباً لکھی نہیں گئی ؛لیکن رجال اور تراجم کی کتابوں میں عموماً ان کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں، ان میں سے تبیین کذب المفتری فیما نسب الی ابی الحسن الاشعری اور طبقات الشافعیۃ خاصۃ ذکر کے قابل ہیں، پہلی کتاب علامہ ابن عساکر دمشقی مشہور محدث کی تصنیف ہے، یہ کتاب اصل میں امام اشعری کے حالات میں ہے؛ لیکن اشاعرہ میں جو لوگ مشاہیر تھے، ان کا بھی تذکرہ ہے، اور چوں کہ عبدالغافر فارسی کے حوالے سے لکھے ہیں، جو خود امام غزالی کے ہم عصر تھے، اس لئے جس قدر لکھا ہے، حرف حرف سند کے قابل ہے، یہ کتاب یوروپ میں چھپ گئی ہے، دوسری کتاب علامہ ابن السبکی کی تصنیف ہے جو مشہور محدث تھے، یہ کتاب اس جامعیت سے لکھی گئی ہے کہ مجموعی حیثیت سے رجال کی کوئی کتاب اس کی ہمسری نہیں کر سکتی، امام غزالی کا جس قدر حال اس کتاب میں

(۱) ریختہ پر الغزالی کے کئی ایڈیشن ہیں، ۱۹۵۶، ۱۹۲۵، ۱۹۲۳، ۱۹۰۲ء، یہ سب قدیم ایڈیشن ہے۔

ہے، کسی کتاب میں اس سے زائد کیا، اس کے برابر بھی نہیں مل سکتا، اس لئے میں نے سوانح عمری کے متعلق زیادہ تر ان ہی دونوں کتابوں پر مدار رکھا۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی کے اس بیان میں کئی باتیں محل نظر ہیں، ان کا ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے۔

طبقات الشافعیہ رجال کی سب سے جامع کتاب نہیں

اولاً کہ سبکی کی طبقات الشافعیۃ الکبریٰ رجال کی سب سے جامع کتاب نہیں ہے، رجال کی کئی کتابیں ایسی ہیں، جو طبقات الشافعیہ سے بہتر اور جامع ہیں، دور کیوں جائیں خود سبکی کے استاد حافظ ذہبی کی ''تاریخ الاسلام'' اور ''سیر اعلام النبلاء'' کسی بھی میزان پر طبقات الشافعیہ سے کم تر نہیں ہیں، ہاں اگر علامہ شبلی نعمانی یہ لکھتے کہ مسالک اور مذاہب کے رجال اور طبقات پر لکھی گئی کتابوں میں یہ کتاب سب سے جامع اور مفصل ہے تو یہ بات صحیح ہوتی، ورنہ جہاں تک مطلقاً رجال پر لکھی گئی کتابوں کی بات ہے تو طبقات الشافعیہ کے مقابلے میں حافظ ذہبی کے علاوہ دیگر حضرات کی کتابیں بھی رکھی جاسکتی ہیں۔

امام غزالی کے حالات پر دیگر مستند کتابوں کا تذکرہ

دوسرے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ابن عساکر نے صرف تبیین کذب المفتری میں ہی نہیں ؛ بلکہ تاریخ دمشق میں بھی امام غزالی کے حالات عبدالغافر فارسی کے حوالہ سے بیان کئے ہیں ؛ لہٰذا اس کا بھی درجہ استناد کسی بھی طرح تبین کذب المفتری سے کسی طرح کم نہیں، اسی طرح عبدالغافر فارسی کی کتاب ''السیاق فی تاریخ نیسابور'' ہے، اصل کتاب تو موجود نہیں ؛ لیکن اس کا انتخاب جو ابواسحاق ابراہیم بن محمد الصریفینی نے کیا ہے، وہ شائع ہو چکی ہے، اس میں بھی امام غزالی کے مختصر حالات موجود ہیں اور اس کے استناد کا بھی درجہ کسی طرح تبین کذب المفتری اور طبقات الشافعیہ سے کم نہیں ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ خود امام غزالی کی مشہور تصنیف ''المنقذ من الضلال'' میں بھی ان کی سیرت وسوانح کا ایک معتد بہ حصہ موجود ہے، پتہ نہیں علامہ شبلی نے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا۔

امام غزالی کے خاندان کی علمی شخصیت

امام غزالی کے خاندان کے حالات میں علامہ شبلی نعمانی نے یہ تو بیان کیا ہے کہ ان کے والد تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ گئے تھے ؛ لیکن یہ بات علامہ شبلی نعمانی نے بیان نہیں کی کہ امام غزالی کے چچا یا دادا کے بھائی احمد بن مُحَمَّد الشَّیْخ ابُو حَامِد الْغَزالِیّ بڑی علمی شخصیت تھے،(۲) چوں کہ ان کا ذکر خود علامہ سبکی نے

(۱) الغزالی، ص:4,3۔ (۲) دیکھئے: طبقات الشافعیۃ الکبری للسبکي:4/87۔

بھی کیا ہے، جو بطور اہم مرجع علامہ شبلی نعمانی کے بھی سامنے تھی، لہٰذا اس معاملے میں یہ عذر بھی نہیں ہے کہ ان کا ذکر ایسے مصادر ومراجع میں ہو، جو ان کو دستیاب نہیں ہو سکے تھے، علامہ سبکی کے علاوہ جمال الدین اسنوی نے بھی ان کو امام غزالی کا چچا مانا ہے،(۱) جیسا کہ کاتب چلپی یا حاجی خلیفہ نے علامہ اسنوی کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔(۲)

علامہ شبلی نعمانی نظام الملک کے متعلق لکھتے ہیں :

> امن وامان اور نظم ونسق کے بدولت تمام ملک کے ڈانڈے اس طرح ملا دیئے کہ جب بادشاہی لشکر نہر جیجون سے اُترا تو کشتیوں کے کرایہ کا پروانہ جس کی تعداد گیارہ ہزار اشرفیاں تھیں، شام کے عامل کے نام لکھا اور وہیں سے یہ رقم ادا کی گئی۔(۳)

علامہ شبلی نعمانی نے اس واقعہ کے لئے وفیات الاعیان کا حوالہ دیا ہے اور یہ واقعہ اس میں موجود ہے؛ لیکن روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء میں یہ واقعہ دوسری طرح موجود ہے، میر خواند لکھتے ہیں :

> سمرقند سے واپسی کے وقت سلطانی افواج نے جن کشتیوں کے ذریعہ دریائے جیجون عبور کیا، خواجہ نظام الملک نے ان کے ملاحوں کو نقد کرایہ ادا کرنے کے بجائے حاکم انطاکیہ (شام) کے نام ہنڈی جاری کی کہ وہ ان کی اُجرت خزانہ انطاکیہ سے ادا کرے، غریب ملاح اس پر بڑے پریشان ہوئے اور انھوں نے بارگاہ سلطانی میں فریاد کی کی ہمارے لئے انطاکیہ جا کر کرایہ وصول کرنا محال ہے، اس لئے ہمارا حساب یہیں بے باق کرنے کا حکم دیا جائے، سلطان نے خواجہ سے اس بارے میں استفسار کیا تو اس نے عرض کیا کہ میرے اس حکم کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں پر سلجوقی سلطنت کی وسعت اور شوکت کی دھاک بٹھائی جائے اور وہ یہ سن کر ششدر رہ جائیں کہ سلطان ملک شاہ کے حکم سے جیجون کے کشتی بانوں نے اپنی اجرت انطاکیہ کے خزانے سے وصول کی، ملک شاہ خواجہ کا جواب سن کر ہنس پڑا اور اس نے کہا کہ بلاشبہ تمہاری نکتہ سنجی قابل داد ہے؛ لیکن یہ غریب کہاں کہاں مارے پھریں گے، مناسب یہی ہے کہ ان کی اجرت اسی جگہ ادا کردی جائے؛ چنانچہ خواجہ نے اسی وقت ملاحوں کا حساب بے باق کردیا۔(۴)

---

(۱) قال الاسنوی: هوعم حجۃ الاسلام الغزالی، سلم الوصول إلى طبقات الفحول: 1/247۔

(۲) دیکھئے: سلم الوصول إلى طبقات الفحول: 1/247۔ (۳) الغزالی، ص: 13۔

(۴) روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملک والخلفاء، بحوالہ ملک شاہ سلجوقی، مصنف: طالب ہاشمی، ص: 105۔

یہ صحیح ہے کہ ابن خلکان ملک شاہ کے دور سے قرب زمانی رکھتے ہیں اور اس بنیاد پر ان کی بات زیادہ معتبر ہونی چاہئے؛لیکن دوسری طرف اس سے بھی انکار مشکل ہے کہ نویں صدی ہجری کا مؤرخ محمد بن خاوندشاہ المعروف بخواندمیر (متوفی: 903ھ) اس واقعہ کے مقام سے قرب مکانی رکھتا ہے، یعنی مصنف بھی ماوراء النہر (بخاریٰ) کا ہی رہنے والا ہے اور جہاں یہ واقعہ پیش آیا یعنی سمرقند، وہ بھی ماوراء النہر کا ہی علاقہ ہے، اس کے علاوہ حدیث رسول بھی ہے کہ مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے قبل مزدوری ادا کردی جائے ، ملک شاہ کی عدل گستری کا بھی تقاضا یہی تھا کہ وہ مزدوروں کو مزدوری کے لئے طویل مسافت کے سفر کی مشقت سے بچائے اور ان کی مزدوری وہیں ادا کردی جائے ، اُصول تاریخ کی حیثیت سے بھی ہم دیکھیں تو مثبت منفی پر مقدم ہوتا ہے کے اُصول کی روشنی میں خواندمیر کا بیان قابل ترجیح ہے۔

امام غزالی کے جرجانی استاذ کا صحیح نام

علامہ شبلی نعمانی مزید لکھتے ہیں :

اس کے بعد جرجان کا قصد کیا اور امام ابونصر اسماعیلی کی خدمت میں تحصیل شروع کی۔(۱)

ابونصر اسماعیلی کی شاگردی کا ذکر ابن نجار، حافظ ذہبی، سبکی، حافظ ابن کثیر ودیگر نے بھی کیا ہے، (۲) ابونصر اسماعیلی کا ذکر اگرچہ ان اکابر کی پیروی میں علامہ شبلی نعمانی نے بھی کیا ہے؛لیکن تاریخی لحاظ سے یہ غلط ہے؛ کیوں کہ ابونصر اسماعیلی جس کا ذکر ان حضرات نے کیا ہے، وہ مُحَمَّد ابْن الإِمَام أَبِي بكر أحْمد بن إِبْرَاهِيم بن إِسْمَاعِيل أَبُو نصر الْإِسْمَاعِيلِي ہیں، اور ان کے ترجمہ میں حافظ ذہبی اور سبکی دونوں نے خود ہی یہ بیان کیا ہے کہ ان کا انتقال 405ھ میں ہو چکا تھا :

وَكَانَت وَفَاته فِي يَوْم الْأَحَد وَ دفن يَوْم الِاثْنَيْنِ لثلاث بَقينَ من شهر ربيع الآخر سنة خمس وَ أَرْبَع مِائَة ۔ (۳)

ان کا انتقال بروز اتوار ہوا، تدفین پیر کو ستائیس ربیع الآخر ۴۰۵ھ میں ہوئی۔

تُوُفِّيَ : فِي رَبِيْعٍ الآخِرِ ، سَنَةَ خَمْسٍ وَ أَرْبَعِ مائَةٍ ۔ (۴)

---

(۱) الغزالی،ص:۷۔

(۲) دیکھئے: تاریخ بغداد وذیولہ، ط:العلمیۃ: 21/27، سیر اعلام النبلاء، ط: الرسالۃ: 19/335، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی: 6/195۔

(۳) طبقات الشافعية الكبرى للسبكي: 4/92۔

(۴) سیر أعلام النبلاء: 17/89۔

ایسے میں یہ کیوں کر ممکن ہے کہ امام غزالی جن کی پیدائش ہی 450 ہجری کی ہے، وہ اپنی پیدائش سے پینتالیس سال قبل ہی ان کے شاگرد بن جائیں۔

علامہ شبلی نعمانی پر اس مسئلے میں زیادہ حیرت نہیں ہے کہ وہ کیسے اس معاملہ میں چوک گئے ؛ کیوں کہ وہ رجال کے مردِ میدان نہیں ہیں، حیرت حافظ ذہبی، سبکی اور ابن کثیر جیسے رجال کے ماہرین اور ناقدین پر ہے کہ ان کی ناقدانہ نگاہ سے یہ سامنے کی بات کیسے اوجھل ہوگئی؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ ابونصر اسماعیلی نہیں ہیں تو پھر کون ہیں؟ رجال وتراجم کی کتابوں کے کھنگالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابونصر اسماعیلی نہیں ؛ بلکہ ابوالقاسم اسماعیلی ہیں، (۱) آپ کا نام اسماعیل اور والد کا نام مسعدہ اور دادا کا نام اسماعیل ہے، آپ مشہور محدث ابوبکر اسماعیلی کے پوتے ہیں، ابوبکر اسماعیلی بڑے مرتبہ کے محدث تھے، انھوں نے صحیح بخاری پر استخراج کیا تھا، مشہور محدث دارقطنی ان کے بارے میں فرماتے تھے ”علم حدیث میں ان کا جو مقام تھا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ بخاری پر مستخرج نہ لکھ کر مستقل کوئی حدیث کی کتاب تالیف کرتے، (۲) بہرحال ابوالقاسم اسماعیلی کا تذکرہ متعدد تذکرہ نگاروں نے کیا ہے اور فقہ میں ان کی مہارت کا اعتراف کیا ہے، (۳) اس کے علاوہ دیگر کتابوں میں بھی آپ کا ترجمہ ملتا ہے اور تمام تذکرہ نگاروں نے آپ کی تاریخ وفات 477ھ بتائی ہے، اور اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ آپ کا انتقال جرجان میں ہوا ہے، ان تمام اُمور سے یہ بات بخوبی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آپ ابوالقاسم اسماعیلی کے شاگرد تھے، نہ کہ ابونصر اسماعیلی کے، اور جن لوگوں نے ابونصر اسماعیلی کا ذکر کیا ہے ان کو اشتباہ لاحق ہوا ہے۔

امام الحرمین کا درپردہ حسد

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

> امام غزالیؒ نے جیسا کہ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ امام الحرمین کی زندگی میں ہی شہرت عام حاصل کر لی تھی اور صاحب تصنیف ہوگئے تھے، یہاں تک کہ امام الحرمین ان پر ناز کرتے تھے۔ (۴)

---

(۱) امام صاحب کے جرجانی استاذ کے نام میں اس غلطی کی جانب سب سے پہلے فرید جبر نے اپنے مقالہ میں توجہ دلائی ہے، انھوں نے یہ مقالہ قاہرہ کے میگزین Mideo جلد:۱ص:۷۷، ۱۹۵۴ء میں لکھا تھا، (بحوالہ مؤلفات الغزالی: ۴)۔

(۲) سیر اعلام النبلاء:8/ 253۔ (۳) دیکھئے: تاریخ الإسلام تبشار:10 / 404، تاریخ بغداد وذیوله، ط: العلمية: 21 / 63، المنتخب من كتاب السياق لتاريخ نيسابور، ص:146، طبقات الشافعية الكبرى للسبكي:4 / 294، التقييد لمعرفة رواة السنن والمسانيد، ص:204۔ (۴) الغزالی، ص:11۔

امام غزالی کی سوانح میں ایک اہم بات جس کا ذکر عبدالغافر فارسی نے پورے وثوق کے ساتھ کیا ہے اور عبدالغافر فارسی کے حوالہ سے مشہور محدث ابن عساکر نے تاریخ دمشق اور تبیین کذب المفتری میں کیا ہے اور جس کا ذکر حافظ ذہبی نے تاریخ الاسلام اور سیر اعلام النبلاء میں کیا ہے، علامہ شبلی نعمانی نے ''الغزالی'' میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے اور وہ بات یہ ہے کہ بقول حافظ رسی :

> امام غزالی کی جودت طبع، ذہن کی دراکی، بات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت اور اسے عام فہم انداز بیان اور دل میں اُتر جانے والے اُسلوب وتعبیر میں بیان کرنے کی صلاحیت سے امام الحرمین در پردہ حسد کے شکار تھے، بظاہر ان کی تعریف کرتے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے؛ لیکن در پردہ وہ ان کی صلاحیتوں سے خائف رہتے تھے۔

حافظ عبدالغافر الفارسی کا یہ بیان اس لئے نہایت اہم ہے؛ کیوں کہ وہ بذات خود امام الحرمین کے بھی شاگرد ہیں اور چار سال تک ان سے کسب فیض کیا ہے، (۱) اور یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ عبدالغافر فارسیؒ امام غزالی کے استاذ بھائی ہیں، یعنی جب امام غزالی امام الحرمین سے تحصیل علم میں مشغول تھے، بعینہ انہی دنوں میں عبدالغافر فارسی بھی امام الحرمین سے تحصیل علم کر رہے تھے، مشہور محدث ابن صلاح لکھتے ہیں :

> ذكر أَبُو الْحسن عبد الغافر بن إِسْمَاعِيل الْفَارِسِي وَكَانَ شَرِيكا لَهُ فِي تلمذة إِمَام الْحَرَمَيْن ۔ (۲)
>
> اس بات کا ذکر عبدالغافر بن اسماعیل فارسی نے کیا ہے، وہ امام الحرمین کی شاگردی میں امام غزالی کے شریک ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالغافر فارسی نے جو کچھ اس بارے میں بیان کیا ہے وہ شنید نہیں؛ بلکہ دید ہے اور آنکھوں دیکھی بات کے اعتبار اور استناد کا درجہ بہت زیادہ ہے۔

عبدالغافر فارسی امام الحرمین کی امام غزالی سے در پردہ حسد اور اس کی وجہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> وكان الإمام مع علو درجته لا يصفي نظره إلى الغزالي سترا لإنافته عليه في سرعة العبارة وقوة الطبع ولا يطيب له تصديه للتصانيف و إن كان منتسبا إليه كما لا يخفي من طباع البشر لكنه يظهر التبجح به والاعتداد بمكانه ظاهرا خلاف ما يضمره ۔ (۳)

(۱) وفیات الأعیان:3/225۔ (۲) طبقات الفقهاء الشافعية:1/260، دار البشائر الإسلامية، بيروت۔

(۳) تاريخ دمشق لابن عساكر:55/201۔

امام الحرمین علوم مرتبت کے باوجود امام غزالی کے ساتھ پورے مخلص نہیں تھے ؛ کیوں کہ امام غزالی کی طبیعت کی روانی اور عبارتوں کے مفہوم کو سمجھنے میں سرعت سے ان کو ایک گونہ حسد تھا اور نہ ہی وہ امام غزالی کے تصنیف وتالیف کے مشغلہ کو پسند کرتے تھے، اگرچہ امام الحرمین بظاہر ان کی تعریف کرتے ؛ لیکن در پردہ ان کا حال دوسرا تھا۔

یہی بات ابن عساکر نے تبیین کذب المفتری میں حافظ عبدالغافر فارسی کے حوالہ سے بیان کی ہے۔(۱)

اور یہی بات حافظ عبدالغافر فارسی کے حوالہ سے حافظ ذہبی نے '' تاریخ الاسلام'' اور '' سیر اعلام النبلاء '' میں امام غزالی کے ترجمہ میں نقل کیا ہے، ہاں سبکی اور ان کی پیروی میں بعد کے مورخین کے یہاں ایک تبدیلی یہ آئی ہے کہ انھوں نے حافظ عبدالغافر فارسی کی اس بات کو کہ امام غزالی سے امام الحرمین در پردہ حسد کرتے تھے، قال کے جزم کے صیغہ کے بجائے یقال کے مجہول اور مشکوک صیغہ سے ادا کیا ہے :

وَيُقَال إن الإمَام كَانَ بِالآخِرَة يمتعض مِنْهُ فِي الْبَاطِن وَ إِن كَانَ يظْهر التبجح بِهِ فِي الظَّاهِر ۔ (۲)

اور کہا جاتا ہے کہ امام الحرمین ان سے در پردہ خصومت رکھتے تھے، اگرچہ بظاہر ان کی تعریف وتوصیف کرتے تھے۔

علم جرح وتعدیل سے واقفیت رکھنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ علامہ سبکی بھی باوجود تمام علم وفضل کے اشاعرہ سے محبت میں کسی حد تک متعصب واقع ہوئے تھے، جیسا کہ خود حافظ سخاوی نے بیان کیا ہے، (۳) اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ علامہ سبکی کو امام غزالی اور امام الحرمین دونوں سے بہت عقیدت ہے اور عبدالغافر فارسی کی بات سے امام الحرمین کی شخصیت پر زد پڑتی ہے ؛ لہٰذا انھوں نے عبدالغافر فارسی کی تمام باتیں تو جزم کے ساتھ نقل کیں اور بیان کے اس مرحلہ کو '' یقال '' سے ذکر کر دیا۔

علامہ شبلی نعمانی کا عقیدت مندانہ یا انشا پردازانہ غلو

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

جب تک امام الحرمین زندہ رہے، ان کی صحبت سے الگ نہ ہوئے، ان کے انتقال کے

---

(۱) تبيين كذب المفتري فيما نسب إلى الأشعري، ص: 292۔ (۲) طبقات الشافعية الكبرى للسبكي: 6/196۔

(۳) دیکھئے: الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ للسخاوی، ص: 94، طبع مؤسسۃ الرسالۃ۔

بعد نیشاپور سے نکلے اور اس شان سے نکلے کہ تمام ممالک اسلامیہ میں ان کا کوئی
ہمسر نہ تھا۔(۱)

یہ سوانح نگاری میں ایک سوانح نگار کا عقیدت مندانہ، یا انشا پردازانہ غلو ہے، جس سے بہرصورت بچنا چاہئے تھا، یہ بات قابل تسلیم ہے کہ امام غزالی جب امام الحرمین کے انتقال کے بعد نیشاپور سے باہر نکلے تو وہ ایک جید بلکہ متبحر عالم ہو چکے تھے؛ لیکن یہ کہنا کہ اس وقت تمام ممالک اسلامیہ میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، درست نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ کس فن میں وہ اتنا آگے بڑھ چکے تھے کہ تمام ممالک اسلامیہ میں اس وقت ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، حدیث کے بارے میں وہ خود بیان کرتے ہیں کہ بضاعتی مزجاۃ یعنی اس میں مہارت نہیں رکھتے، (۲) نحو وغیرہ کے بارے میں ان کا اپنا اعتراف ہے کہ اس میں ان کو مہارت نہیں ہے، ابن کثیر نحو اور حدیث میں ان کی کمزوری بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

وجمع من كل فن وصنف فيه إلا النحو ، فإنه لم يكن فيه بذلك ولا الحديث ، فإنه كان يقول : أنا مزجي البضاعة في الحديث ۔ (۳)

امام غزالی نے ہر فن میں تصنیف وتالیف کیا، سوائے نحو کہ؛ کیوں کہ نحو اور حدیث میں ان کو درک وکمال نہیں تھا، اور حدیث کے بارے میں امام غزالی خود کہا کرتے تھے کہ حدیث کے علم میں میرا سرمایہ ملا جلا ہے۔

فلسفہ میں انھوں نے بغداد آکر توجہ کی، فقہ کی جہاں تک بات ہے تو اس وقت تک ان کے پاس اس باب میں صرف دو تصنیف تھی: ایک تو وہی ابوالقاسم اسماعیلی کے درس کے نوٹس (یادداشت) اگر اسے تصنیف سمجھا جائے تو، اور دوسرے منخول، (منخول پر تفصیلی بحث آگے آرہی ہے) اس منخول کا بھی حال یہ ہے کہ کسی بھی فقیہ نے اس کتاب پر توجہ نہیں کی، جن کتابوں کی وجہ سے امام غزالی فقیہ تسلیم کئے گئے ہیں اور جن پر شافعی فقہاء نے توجہ کی ہے، وہ تمام کی تمام بغداد کے قیام کے بعد کی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانی خود امام الحرمین کے واسطہ سے ان کے دو درسی ساتھی کیّا ہراسی اور خوافی کی فضیلت نقل کر چکے ہیں :

امام الحرمین کے حلقہ درس میں چار سو طلباء تعلیم پاتے تھے، ان میں تین شخص سب میں

(۱) الغزالی، ص:11۔ (۲) الرد علی المنطقیین:2/207، دار الفکر، لبنان۔
(۳) طبقات الشافعیین، ص:534۔

ممتاز تھے، کیا ہراسی، احمد بن محمد خوافی، اور امام غزالی؛ چنانچہ امام الحرمین کہا کرتے تھے، غزالی دریائے زخار ہے، اور کیا شیر درندہ اور خوافی آتش سوزاں۔(۱)

ایک دوسرے بیان میں جو سلفی نے فقہاء سے نقل کیا ہے کہ امام الحرمین کہا کرتے تھے :

إذا ناظروا : التحقيق للخوافي ، والجريان للغزالي ، والبيان للكيا۔ (۲)

مناظرہ میں تحقیق کا مقام خوافی کے لئے خاص ہے، اور برجستگی و بداہت میں امام غزالی فائق ہیں اور بیان و وضاحت کیا ہراسی کے لئے مخصوص ہے۔

امام الحرمین کا انتقال ۴۷۸ھ میں ہوا، اور اسی سال امام غزالی نے نظام الملک کی جانب قصد کیا، سوال یہ ہے کہ امام الحرمین کے انتقال اور نیشاپور سے کوچ کرنے کے مختصر عرصہ میں ایسا کیا انقلاب آ گیا کہ پورے ممالک اسلامیہ میں کوئی ان کا ہمسر نہیں تھا؟

اگر کسی کو یہ خیال ہوا کہ انھوں نے اس پیراگراف کی ابتداءً ابن خلکان کا حوالہ دیا ہے؛ لہٰذا تمام ممالک اسلامیہ میں ان کے ہمسر نہ ہونے کی بات ابن خلکان نے کہی ہے؛ لہٰذا ذمہ داری ان کی ہے، تو یہ بات بھی درست نہیں ہے، ابن خلکان نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے، ابن خلکان بیان کرتے ہیں :

ثم قدم نيسابور واختلف إلى دروس إمام الحرمين أبي المعالي الجويني ، وجد في الاشتغال حتى تخرج في مدة قريبة ، وصار من الأعيان المشار إليهم في زمن أستاذه ، وصنف في ذلك الوقت ، وكان أستاذه يتبجح به ، ولم يزل ملازما له إلى أن توفي في التاريخ المذكور في ترجمته ، فخرج من نيسابور إلى العسكر ، ولقي الوزير نظام الملك فأكرمه وعظمه وبالغ في الإقبال عليه ۔ (۳)

پھر امام غزالی نیشاپور آئے اور امام الحرمین ابوالمعالی کی شاگردی اختیار کی، آپ نے بڑی محنت سے علم حاصل کیا یہاں تک کہ تھوڑے عرصہ میں تمام رسمی علوم میں ماہر ہو گئے اور اپنے استاذ کے حین حیات ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے، اور تصنیف وتالیف میں لگ گئے اور آپ کے استاذ بھی آپ کے بلندی مرتبت کا اعتراف کرتے تھے، آپ اپنے استاذ کے دامن سے ان کی زندگی تک وابستہ رہے، جب امام الحرمین کا

(۱) الغزالی، ص:11۔ (۲) سیر أعلام النبلاء، ط: الحدیث: 14/282۔ (۳) وفیات الأعیان: 4/217۔

انتقال ہوا تو نیشاپور سے چھاؤنی کے لئے روانہ ہوئے ،سلجوقی سلطنت کے وزیر نظام الملک سے ملاقات کی،نظام الملک نے آپ کا بڑا اکرام واحترام کیا۔

اس بیان میں ڈھونڈنے سے بھی تمام ممالک اسلامیہ میں ان کے ہمسر نہ ہونے کی مبالغہ آرائی کا ذکر نہیں ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کو ابن خلکان کے امام غزالیؒ کے ترجمہ میں ابتداء میں کہے گئے الفاظ سے کچھ اشتباہ ہوگیا،ابن خلکان نے جو بات امام غزالی کے آخر عمر کے متعلق کہی تھی ،اور صرف شوافع کے گروہ کے بارے میں کہی تھی ،اس کو انھوں نے امام الحرمین کی شاگردی کے فوراً بعد پر منطبق کردیا،اور پورے عالم اسلام کو اس میں بلا لحاظ مسلک وملت شامل کردیا،ابن خلکان لکھتے ہیں :

أبو حامد محمد بن محمد بن محمد بن أحمد الغزالي ، الملقب حجة الإسلام زين الدين الطوسي الفقيه الشافعي ، لم يكن للطائفة الشافعية في آخر عصره مثله ۔ (۱)

ابو حامد محمد بن محمد بن محمد الغزالی ،آپ کا لقب حجۃ الاسلام زین الدین طوسی ہے،آپ شافعی فقیہ تھے،عمر کے آخری پڑاؤ میں گروہ شافعیہ میں آپ کا ہمسر ونظیر کوئی نہیں تھا۔

یہ بھی واضح رہے کہ شمس الائمہ امام سرخسی صاحب مبسوط کا انتقال ۴۸۳ھ یا ۴۹۰ھ میں روایات کے اختلاف کے مطابق ہوا،اور علامہ ابوالیسر بزدوی کا انتقال ۴۸۲ھ میں ہوا،ان حضرات کی جلالت علمی کسی صاحب علم سے مخفی نہیں،کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ ۲۸ رسال کی عمر میں امام غزالی امام سرخسی یا امام بزدوی سے علم میں بڑا مرتبہ حاصل کر چکے ہوں گے؟ جس نے المبسوط کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے جس کو علامہ سرخسی نے قید وبند کی حالت میں املاء کرایا تھا، اس فقہی انسائیکلو پیڈیا کو دیکھ کر کیا وہ ایک لمحے کے لئے بھی یقین نہیں کرسکے گا کہ امام غزالی ۲۸ رسال کی عمر میں شمس الائمہ سرخسی سے بڑے فقیہ ہوگئے تھے۔

ابوعلی فارمذیؒ سے بیعت

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

تمام مؤرخین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ امام صاحب کو شیخ ابوعلی فارمذیؒ (فضل بن محمد بن علی) سے بیعت تھی۔(۲)

---

(۱) وفیات الأعیان:216/4۔ (۲) الغزالی،ص:24۔

امام غزالی نے فارمذی سے بیعت کب کی، اس بارے میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

> چوں کہ شیخ موصوف نے ۴۷۷ھ میں بمقام طوس وفات پائی؛ اس لئے ضرور ہے کہ امام غزالی نے طالب علمی ہی کے زمانے میں جب ان کی عمر ۲۷/برس سے زیادہ نہ تھی، فقر کی بیعت حاصل کی ہوگی۔(۱)

سوال یہ ہے کہ فارمذی سے بیعت کرنے کا پس منظر کیا تھا، اس زمانے میں جب کہ امام صاحب امام الحرمین جوینی سے کسب فیض کر رہے تھے، اس وقت امام صاحب پر خود پرستی کا غلبہ تھا اور خود علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے :

> امام غزالی کا مزاج ابتدا میں جاہ پسند تھا، امام الحرمین کی صحبت میں انھوں نے علماء کی قدر و منزلت کا جو سماں دیکھا تھا، اس نے ان کی طبیعت میں اس ولولے کو اور زیادہ بڑھا دیا تھا۔(۲)

یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام صاحب کی طبیعت شروع سے ہی تحقیق و جستجو کی جانب مائل تھی، جو نئی چیز سامنے آتی، اس کی تحقیق کرتے، ان کی اصل حقیقت اور کنہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے خواہ وہ کوئی بھی فن کیوں نہ ہو، امام غزالی میں جستجو کا یہ جذبہ خود ان کے اعتراف کے مطابق بیس سال کی عمر سے قبل پیدا ہو گیا تھا :

> ولم أزل في عنفوان شبابي منذ راهقت البلوغ ، قبل بلوغ العشرين إلى الآن ، وقد أناف السن على الخمسين أقتحم لجة هذا البحر العميق ، وأخوض غمرته خوض الجسور ، لا خوض الجبان الحذور ، وأتوغل في كل مظلمة ، وأتهجّم على كل مشكلة ، وأتقحم كل ورطة ، وأتفحص عن عقيدة كل فرقة ، وأستكشف أسرار مذهب كل طائفة ، لأميز بين محق ومبطل ، ومتسنن ومبتدع ۔ (۳)

وہ نوجوانی میں نیشاپور آئے اور امام الحرمین کی درسگاہ سے وابستہ ہوگئے، امام الحرمین کی خدمت میں انھوں نے فقہ، اُصول فقہ اور علم کلام میں مہارت پیدا کی، چوں کہ اسی زمانے میں ابوعلی فارمذی بھی نیشاپور میں تھے اور ایک صوفی کے طور پر ان کا بڑا شہرہ تھا؟ پھر ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہئے کہ امام صاحب کے والد بھی صوفی تھے،

(۱) الغزالی، ص:24۔ (۲) الغزالی، ص:15۔ (۳) المنقذ من الضلال، ص:109۔

آخراس کا بھی کچھ نہ کچھ اثر تو رہا ہوگا، عبدالغافر فارسی بتاتے ہیں کہ ان کو امام غزالی نے کئی راتوں میں انھیں اس کا یا پلٹ کی تفصیل بتائی تھی، جس کا حاصل یہ ہے کہ علوم کی تحصیل وتکمیل کے بعد ان کو مرنے کے بعد کے احوال اور قیامت کی ہولنا کیوں اور حساب وکتاب کی فکر دامن گیر ہوئی، انھوں نے مشہور شیخ طریقت ابوعلی فارمذی کی صحبت میں اُٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا، اوران سے بیعت ہو گئے، ابوعلی فارمذی نے امام غزالی کو اوراد و وظائف کی تاکید کے ساتھ نوافل کی کثرت اور ہمیشہ اللہ کے ذکر میں مصروف رہنے کی تاکید کی اور عبادات میں پوری جانفشانی برتنے کی نصیحت کی، امام غزالی نے ابوعلی فارمذی کے ارشادات کو حرز جان بنایا اور اس پر تہہ دل سے عمل پیرا ہو گئے، یہاں تک کہ انھوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا :

وحكى لنا في ليال له فيه أحواله من ابتداء ما ظهر له سلوكه طريق التأله وغلبة الحال عليه بعد تبحره في العلوم واستطالته على الكل بكلامه والاستعداد الذي خصه الله به في تحصيل أنواع العلوم وتمكنه في البحث والنظر حتى تبرم من الاشتغال بالعلوم العرية عن المعاملة وتفكر في العاقبة وما يجري وينفع في الآخرة فابتدأ بصحبة الفارمذي وأخذ منه استفتاح الطريقة وامتثل ما كان يشير به عليه من القيام بوظائف العبادات والإمعان في النوافل واستدامة الأذكار والجد والاجتهاد طلبا للنجاة إلى أن جاز تلك العقاب وتكلف تلك المشاق وما يحصل على ما كان يطلبه من مقصود ـ (۱)

یہی بات حافظ ذہبی نے بھی عبدالغافر فارسی سے نقل کی ہے۔(۲)

خلاصہ یہ ہے کہ امام غزالی نے امام الحرمین سے علوم کی تکمیل کی اور فوراً بعد ان پر خشیت الٰہی اور آخرت کی فکر دامن گیر ہوئی، اس کے لئے انھوں نے ابوعلی فارمذی کا دامن تھاما اور ان کی ہدایات اور بتائے ہوئے اوراد وظائف پر عمل کرنے لگے۔

صوفیانہ سیر وسیاحت کی ترتیب اور مدت

بغداد سے ذی قعدہ ۴۸۸ھ میں تلاش حق کا سفر کیا؛ اس سفر کے سلسلے میں کئی باتیں تحقیق طلب ہیں، جن پر

(۱) تاریخ دمشق لابن عساکر: 55/203۔

(۲) دیکھئے: سیر أعلام النبلاء، ط: الرسالة: 19/324، تاریخ الإسلام تبشار: 11/64۔

علامہ شبلی نعمانی سرسری طور پر گزر گئے ہیں، (۱) امام صاحب نے کن ملکوں اور شہروں کا سفر کیا اور اس سفر کی ترتیب کیا تھی؟ (۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ اس سفر کی مدت کیا تھی؟ یعنی کتنی مدت اس سفر میں ان کو لگے، (۳) تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا احیاء العلوم اسی سفر کی تصنیف ہے؟

''الغزالی'' میں انھوں نے سفر کی جو ترتیب قائم کی ہے وہ یہ ہے :

> بغداد سے نکل کر شام کا رخ کیا، متصل دو برس تک دمشق میں قیام رہا، (ص:23) دو برس کے بعد دمشق سے بیت المقدس کا رخ کیا، (ص:24) بیت المقدس کی زیارت سے فارغ ہو کر مقام خلیل گئے، پھر حج کی نیت سے مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کا قصد کیا، مکہ میں مدت تک قیام رہا، (ص:25) اسی سفر میں مصر واسکندریہ بھی پہنچے اور اسکندریہ میں مدت تک قیام رہا، (ص:25) ۴۹۹ھ میں مقام خلیل کو پہنچے، (ص:26) حج کرنے کے بعد اہل وعیال کی کشش نے وطن پہنچایا۔ (ص:27)

''الغزالی'' کے جو اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، اس میں تضاد نمایاں ہے، ایک جانب کہتے ہیں مکہ میں قیام کے بعد اسی سفر میں مصر واسکندریہ بھی پہنچے اور دوسری جانب یہ بات بھی کہی جارہی ہے کہ حج کے بعد اہل وعیال کی کشش نے وطن پہنچایا، ظاہر سی بات ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک ہی بات صحیح ہو سکتی ہے، یا تو حج کے بعد وہ مصر واسکندریہ گئے، یا پھر اہل وعیال کی کشش نے وطن پہنچایا، دونوں ایک ساتھ درست نہیں ہو سکتے۔

امام غزالی نے پہلے حج کیا، یا پہلے شام گئے، اس بارے میں بہت اُلجھن ہے، امام غزالی کا اپنا بیان جو المنقذ من الضلال میں ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے شام گئے :

> أظهرت عزم الخروج إلى مكة وأنا أدبر في نفسي سفر الشام حذراً أن يطلع الخليفة وجملة الأصحاب على عزمي على المقام في الشام ، فتلطفت بلطائف الحيل في الخروج من بغداد على عزم أن لا أعاودها أبداً ۔ (۱)
>
> میں نے لوگوں میں یہ ظاہر کیا کہ وہ حج کے لئے مکہ جارہا ہوں؛ لیکن میری نیت شام کے سفر کی تھی، اور یہ اس بناء پر تھا کہ اگر میں شام کے سفر کی نیت کو ظاہر کرتا تو خلیفہ اور دیگر معززین میرے ارادے میں حائل ہو جائے، حسن تدبیر سے کام لیتے ہوئے میں بغداد سے نکلا اور میری نیت یہ تھی کہ میں واپس بغداد کبھی نہیں آؤں گا، پھر کچھ سطروں کے بعد ارشاد فرماتے ہیں: ثم دخلت الشام۔

(۱) المنقذ من الضلال، ص:175۔

اس کے برخلاف عبدالغافر جیسے ان کے حال سے باخبر، ساتھی اور رفیق درس یہ کہہ رہے ہیں:

''وَقصد بَيت الله تَعَالیٰ وَحج ثمّ دخل الشَّام''۔(۱)

پھر ابن عساکر نے تاریخ دمشق،(۲) میں بھی ان کا یہی بیان برضا ورغبت نقل کیا ہے، اس لئے ان کو بھی اس باب میں عبدالغافر فارسی کا ہمنوا سمجھنا چاہئے، عبدالغافر فارسی کا یہی بیان حافظ ذہبی،(۳) حافظ سبکی(۴) ودیگر نے بیان کیا ہے اور اس کے خلاف کوئی بات نہیں لکھی ہے؛ اس لئے ان کو بھی اس باب میں عبدالغافر فارسی کا ہمنوا سمجھنا چاہئے۔

یہی بات ابن خلکان نے بھی لکھی ہے،(۵) یہی بات ابن صلاح نے بھی حافظ فارسی کے حوالہ سے لکھی ہے،(۶) یہی بات ابن کثیرؒ نے بھی لکھی ہے،(۷) اسی کا اعتراف واقرار ابن جوزیؒ نے کیا ہے،(۸) اسی کا اعتراف واقرار علامہ یافعی نے بھی کیا ہے،(۹) اسی کا ذکر علامہ ابوالمحاسن تغری بردی نے کیا ہے،(۱۰) یہی بات ابن عماد حنبلی نے بھی لکھی ہے۔(۱۱)

مؤرخین کے اس جم غفیر کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ ان تمام سے ایک ساتھ غلطی ہوگئی ہوگی اور ان میں سے کسی نے المنقذ من الضلال نہیں دیکھی ہوگی۔

شاید ایسا ہوسکتا ہے کہ امام صاحب کا ارادہ تو شام کا ہی تھا؛ لیکن چوں کہ ذوقعدہ کے آخر میں بغداد سے نکلے تھے، اس وقت بغداد سے حج کی نیت سے نکلنے والے ہزاروں لوگ ہوں گے، اور حج میں کسی بڑے عالم دین کی رفاقت کا شوق بہت سارے لوگوں کو ہوتا ہے، آج بھی ایسا ہی ہے، یقیناً اس بات کی تشہیر کے بعد کہ امام غزالی حج کو جارہے ہیں، بہت سارے لوگوں نے ان کی معیت اختیار کی ہوگی، یہ بھی مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالی نے حج پر رفاقت کی خواہش کرنے والوں کو انکار کردیا ہو اور کہا ہو کہ میں اکیلے سفر کروں گا؛ کیوں کہ اس کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا، بالخصوص ان حالات میں کہ امام صاحب باطنیوں کے عقائد اور فکر کے خلاف فکری جہاد کررہے تھے اور باطنیہ اپنے ہرمخالف کو راستے سے ہٹا رہے تھے، کچھ عرصہ قبل ہی نظام الملک باطنیہ کے خبث باطن کے بھینٹ چڑھ چکا تھا۔

(۱) تبيين كذب المفتري فيما نسب إلى الأشعري: 293۔ (۲) تاريخ دمشق لابن عساكر: 55/201۔

(۳) سير أعلام النبلاء: 14/267۔ (۴) طبقات الشافعية الكبرى للسبكي: 6/197۔

(۵) وفيات الأعيان: 4/217۔ (۶) طبقات الفقهاء الشافعية: 1/261۔

(۷) طبقات الشافعيين، ص: 534۔ (۸) المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: 17/125۔

(۹) مذکورہ کتاب میں علامہ یافعیؒ نے ابن عساکر کے شام میں دس سال قیام کرنے کے بیان پر تو اعتراض کیا ہے؛ لیکن اولاً حج کرنے اور پھر شام جانے کے بیان پر اعتراض نہیں کیا ہے، اس سے بھی ان کا رجحان واضح ہے، دیکھئے: مرآة الجنان وعبرة اليقظان: 3/139۔

(۱۰) النجوم الزاهرة في ملوك مصر والقاهرة: 5/203۔ (۱۱) شذرات الذهب في أخبار من ذهب: 6/20۔

ایسا لگتا ہے کہ امام غزالی کی یہ خواہش رہی ہوگی کہ وہ پہلے شام جائیں اور وہاں ریاضت ومجاہدہ اور نفس کشی کریں؛ کیوں کہ بعض حدیثوں میں شام کی فضیلت وارد ہے اور دوسرے یہ کہ اجنبی مقام پر علائق سے کٹ کر جو دلجمعی اور سکون نصیب ہوتا ہے، وہ وطن یا اپنے مالوف مقام پر مشکل ہے؛ لیکن لوگوں کی معیت اور رفاقت نے اس کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا؛ لہٰذا انھوں نے پہلے حج کیا اور اس کے بعد پھر شام اور دمشق گئے اور المنقذ من الضلال کی تصنیف کے وقت ان کی دل کی خواہش قلم پر آ گئی اور جو اصل صورت حال تھی، وہ بیان نہ ہوسکی، اس قیاس کا جواز اس لئے بھی بنتا ہے کہ امام غزالی نے واضح طور پر اس موقع سے یہ نہیں کہا ہے کہ انھوں نے حج کیا، یا نہیں کیا۔

سفر کی مدت

سفر میں آپ کتنے عرصہ رہے، عبدالغافر فارسی، ابن عساکر، ذہبی، سبکی وغیرہ کی رائے ہے کہ آپ تقریباً دس سال تک سفر میں رہے، اور علامہ شبلی بھی ان ہی کے ہمنوا ہیں؛ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

> زیادہ تحقیق و وکاوش سے معلوم ہوتا ہے کہ دس برس کی مدت سفر میں ان کی حالت یکساں نہیں رہی۔(۱)

دوسری جگہ علامہ شبلی نعمانی نے وضاحت سے لکھا ہے کہ دس سال آپ مسلسل سفر میں رہے اور ایک جگہ سے دوسرے جگہ کچھ کم یا زیادہ عرصہ قیام کرتے رہے اور متبرک مقامات کی زیارت کرتے رہے :

> غرض دس برس تک متصل متبرک مقامات میں پھرتے رہے، اکثر ویرانوں میں نکل جاتے۔(۲)

اس معاملے میں ظاہر ہے کہ اگر امام غزالی کا اپنا کوئی بیان ہو تو سب سے زیادہ اہمیت اسی کی ہے اور یہ بات واضح ہے کہ امام غزالی نے اس بارے میں المنقذ من الضلال میں بالکل صاف صاف تو نہیں؛ بلکہ صاف صاف کے قریب ضرور لکھا ہے اور جس سے یہ مفہوم ضرور پیدا ہوتا ہے کہ دس سالہ سفر کی جو بات حافظ فارسی وابن عساکر ودیگر مؤرخین نے کہی ہے، اس باب میں ان کو اشتباہ ہوا ہے، امام غزالیؒ لکھتے ہیں :

> ثم دخلت الشام ، وأقمت به قريباً من سنتين اشغل الشغل لي إلا العزلة والخلوة ، والرياضة والمجاهدة ، اشتغالاً بتزكية النفس ، وتهذيب الأخلاق ، وتصفية القلب لذكر الله تعالى ، كما كنت حصلته من كتب الصوفية ، فكنت أعتكف مدة في

(۱) الغزالی، ص:27۔ (۲) الغزالی، ص:25۔

مسجد دمشق ، أصعد منارة المسجد طول النهار ، وأغلق بابها على نفسي ، وثم رحلت منها إلى بيت المقدس ، أدخل كل يوم الصخرة ، وأغلق بابها على نفسي ، ثم تحركت في داعية فريضة الحج ، والاستمداد من بركات مكة المدينة وزيارة رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد الفراغ من زيارة الخليل صلوات الله وسلامه عليه ، فسرت إلى الحجاز ، ثم جذبتني الهمم ، ودعوات الأطفال إلى الوطن ۔ (۱)

پھر میں شام گیا اور وہاں تقریباً دو سال تک رہا، وہاں میرا مشغلہ اور میری مصروفیت خلوت وگوشہ نشینی میں ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ تزکیہ نفس، تہذیب اخلاق اور اللہ کی یاد کے لئے قلب کی صفائی تھا، یہ اشغال میں ایسے ہی کرتا تھا، جیسا کہ میں نے صوفیاء کرام کی کتابوں میں پایا تھا، میں نے ایک مدت تک مسجد دمشق میں اعتکاف کیا، مسجد کے مینارہ پر چڑھ کر دروازہ بند کرلیتا تھا اور پورا دن اسی طرح گزرتا تھا، پھر میں نے دمشق سے کوچ کیا اور بیت المقدس پہنچا، وہاں میرا معمول یہ رہا کہ میں صخرہ میں داخل ہوکر دروازہ بند کرلیتا تھا، بیت المقدس سے میں مقام خلیل گیا، اور وہاں میرے اندر فریضہ حج کی ادائیگی اور مکہ ومدینہ کی برکتوں سے مستفید ہونے اور روضہ رسول ﷺ کی زیارت کا داعیہ پیدا ہوا ، میں نے حج کے لئے رخت سفر باندھا ، بعد ازاں دل کی کشش اور بچوں کی محبت نے وطن کی طرف کھینچا۔

اس پورے بیان میں دس سال والی بات کہیں سے بھی نظر نہیں آتی ؛ بلکہ بمشکل دو ڈھائی سال کی یہ مدت ہوتی ہے، اگر امام غزالی نے کہیں اور کا بھی سفر کیا ہوتا تو اس موقع پر اس کا ذکر ضرور کرتے ،اس کی تائید علامہ یافعی کے بیان سے بھی ہوتی ہے، انھوں نے بھی عبدالغافر فارسی، ابن عساکر وغیرہ کے دس سال شام وغیرہ میں گزارنے کی تردید کی ہے؛ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

قلت : هكذا ذكر بعض المؤرخين ، وقد قدمت في فساد ذلك من البيان ما يدل فيه على البطلان ، والمعروف الذي نص عليه أبو حامد في بعض كتبه أنه أقام في الشام سنتين ۔ (۲)

---

(۱) المنقذ من الضلال،ص:176۔ (۲) مرآة الجنان وعبرة اليقظان:3/139۔

میں کہتا ہوں کہ بعض مؤرخین نے اسی طرح دس سال کی بات کہی ہے، جس کا غلط ہونا
میں پہلے ہی واضح کر چکا ہوں اور مشہور بات جس کی صراحت امام غزالی نے بھی اپنی
بعض کتابوں میں کی ہے، وہ یہ ہے کہ شام میں ان کے اقامت کی مدت دو سال ہے۔

امام غزالی کے سفر کی ترتیب

امام غزالی کی سفر کی روداد کے تعلق سے عجیب اُلجھن ہے، ہر مورخ نے اس کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے، اس سے یہ پتہ چلانا بہت مشکل ہو گیا ہے کہ پہلے کہاں گئے، کہاں کتنا عرصہ قیام کیا، اس کے بعد کس شہر کو شرف بخشا، امام غزالی کے سفر کے سلسلے میں ان کے تراجم وسوانح میں لکھی گئی کتابوں سے استفادہ کے بعد میری اپنی رائے میں ان کے سفر کی ترتیب یہ بنتی ہے۔

امام صاحب ۴۸۸ھ کے ذی قعدہ یا ذی الحجہ کے مہینہ میں بغداد سے نکلے، حج کیا، پھر دمشق گئے، (۱) اب یہ بحث تفصیل کی محتاج ہے اور ما قبل میں اس پر بات ہو چکی ہے کہ پہلے حج کیا یا پھر پہلے دمشق گئے، دمشق میں مختصر عرصہ قیام رہا، دمشق سے بیت المقدس گئے، (۲) بیت المقدس میں احیاء علوم الدین کی تصنیف کا آغاز کیا (المنتظم) بیت المقدس سے مشہد ابراہیمؑ کی زیارت کے لئے گئے، (۳) پھر دمشق واپس آئے اور ایک عرصہ تک دمشق کے جامع اموی کے مغربی کنارہ میں معتکف رہے، (۴) یہاں آپ طلبہ کو درس بھی دیتے رہے، (۵) ۴۸۹ھ میں ہی آپ نے حج کے ارادے سے حجاز کا سفر کیا، (۶) حج سے قبل غالباً بغداد تشریف لائے، (۷) بغداد ہی میں ۴۹۰ھ میں آپ کے شاگرد ابن عربی سے آپ کی ملاقات ہوئی، بغداد میں مختصر قیام رہا، (۸) پھر آپ خراسان کی طرف روانہ ہوئے، (۹) خراسان میں آپ کن شہروں میں گھومے، پھرے، اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی ہے۔

---

(۱) طبقات الشافعية الكبرىٰ طبقات الشافعية الكبرى للسبكي: 6/197۔

(۲) طبقات الشافعية الكبرىٰ طبقات الشافعية الكبرى للسبكي: 6/197۔

(۳) المنقذ من الضلال، ص: 177۔ (۴) طبقات الشافعية الكبرى للسبكي: 6/197۔

(۵) وفیات الاعیان: ۴/۲۱۷۔ (۶) المنقذ من الضلال، ص: 177۔

(۷) یہ واضح نہیں ہے کہ بغداد کا یہ سفر حج کے سفر سے قبل ہوا تھا، یا حج کے بعد ہوا؛ چوں کہ امام غزالی نے المنقذ میں مقام خلیل کی زیارت کے بعد حج بیت اللہ کا ذکر کیا ہے، اسی نسبت سے یہاں بھی سفر حج کو پہلے قرار دیا، ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ حج پہلے کیا ہو، اور بغداد اس کے بعد آئے ہوں؛ کیوں کہ بغداد آمد کا ذکر جمادی الآخر میں ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حج کرنے کے تقریباً چھ ماہ بعد آپ بغداد آئے ہوں، جس کو مورخین نے مکہ معظّمہ میں ایک مدت قیام کرنے سے بھی تعبیر کیا ہے۔

(۸) القواصم والعواصم، بحوالہ مولفات الغزالی، ص: 546۔ (۹) ابن عساکر تاریخ دمشق لابن عساکر: 55/200۔

بہر حال اولاد اور اہل وعیال کی محبت نے آپ کو کھینچا اور آپ ایک طویل عرصہ تک طوس میں ہی قیام پذیر رہے، طوس میں آپ اولاً ایک مدت تک اپنے گھر پر ہی طلبہ کو درس دیتے رہے، پھر اس کو چھوڑ کر عبادت اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے، (۱) ۴۹۸ھ ربیع الاول میں فخر الملک کو سلطان سنجر نے اپنا وزیر بنایا، نیشاپور کی تدریس قبول کرنے کا اصرار حد سے زیادہ بڑھا اور خود مختلف اُمور کی بنیاد پر آپ کو خیال ہوا کہ اب خلوت گزینی ترک کر کے اپنے علم وعمل سے عوام کو فائدہ پہنچانا چاہئے؛ چنانچہ آپ خلوت سے باہر آئے اور نظامیہ نیشاپور میں درس دینے لگے، (المنقذ من الضلال) فخر الملک ۵۰۰ھ میں ایک باطنی کے ہاتھوں شہید ہو گئے؛ لہٰذا تھوڑی مدت کے بعد آپ نے بھی نظامیہ نیشاپور کی تدریس کو خیر باد کہا اور پھر سے طوس میں تشنگان علم کی سیرابی کا سامان مہیا کیا۔ (۲)

امام غزالی کا یوسف بن تاشفین سے ملاقات کیلئے جانے کا عزم

علامہ شبلی نعمانیؒ لکھتے ہیں :

> اسی سفر میں مصر واسکندریہ پہنچے اور اسکندریہ میں مدت تک قیام رہا، ابن خلکان کا بیان ہے کہ یہاں سے یوسف بن تاشفین سے ملنے کے لئے مراکش جانا چاہتے تھے؛ لیکن اسی اثناء میں یوسف کا انتقال ہو گیا اور اس ارادے سے باز آنا پڑا، بعض بزرگوں نے اس روایت کی صحت میں اس لحاظ سے شک کیا ہے کہ امام صاحب تارک الدنیا ہو چکے تھے، کسی امیر اور بادشاہ سے ملنے کیوں جاتے؛ لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب جس امن واطمینان وبے تعلقی کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، وہ ان ممالک میں نصیب نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے مراکش کا قصد کیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ (۳)

علامہ شبلی نعمانی نے جن بزرگ کا نام نہیں لیا ہے، وہ علامہ یافعی ہیں اور یہ بات انھوں نے مرأۃ الجنان وعبرۃ الیقظان فی معرفۃ العبر من حوادث الزمان میں لکھی ہے، علامہ شبلی نعمانی کے مذکورہ بالا اقتباس میں کئی سقم ہیں، جن پر انھوں نے توجہ نہیں دی۔

اولاً یہ کہ جس نے بھی بشمول ابن خلکان یوسف بن تاشفین سے ملنے کی بات کہی ہے، انھوں نے اس کو یقال یا قیل کے مجہول اور مشکوک صیغہ کے ساتھ ذکر کیا ہے، یعنی ان کی بھی نگاہ میں یہ بات مستند نہیں ہے، چاہے یہ ابن خلکان ہوں، (۴) چاہے یہ علامہ صفدی ہوں، (۵) چاہے یہ علامہ سبکی ہوں۔ (۶)

(۱) ابن عساکر تاریخ دمشق لابن عساکر:55/200۔ (۲) طبقات الشافعیۃ الکبری للسبکی:6/200۔
(۳) الغزالی، ص:25۔ (۴) وفیات الأعیان:4/217۔
(۵) الوافی بالوفیات:1/211۔ (۶) طبقات الشافعیۃ الکبری للسبکی:6/199۔

ان مؤرخین کے برخلاف علامہ شبلی نعمانی نے اس کو جزم اور یقین کے ساتھ بیان کیا ہے؛ حالاں کہ مؤرخانہ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ جس چیز کو متقدم مورخین نے شک وشبہ کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کو علامہ شبلی نعمانی بھی اسی طرح بیان کرتے، ہاں اگر علامہ شبلی نعمانی کے پاس جزم ویقین کی کوئی دلیل ہوتی تو اس دلیل کے ساتھ یقین کے ساتھ بیان کرنا درست ٹھہرتا۔

دوسری بات جس پر علامہ شبلی نعمانی نے توجہ نہیں دی ہے اور غور نہیں کیا ہے، وہ یہ ہے کہ یوسف بن تاشفین کی موت ۵۰۰ھ میں ہوئی، اس پر تقریباً تمام مورخین متفق ہیں،(۱) دوسری جانب خود امام غزالی کا اپنا بیان ہے کہ وہ ۴۹۹ھ میں طوس میں تھے اور فخر الملک ابن نظام الملک کے اصرار پر مدرسہ نظامیہ نیشاپور میں تدریس کی درخواست قبول کر کے وہاں جانے کا ارادہ کر رہے تھے :

> ويسر الله الحركة إلى نيسابور ، للقيام بهذا المهم في ذي القعدة سن تسع و تسعين و أربع مئة ، وكان الخروج من بغداد سنة ثمان وثمانين وأربع مئة ، وبلغت العزلة إحدى عشر سنة وهذه حركة قدرها الله تعالى ۔ (۲)

حیرت کی بات یہ ہے کہ خود علامہ شبلی نعمانی نے المنقذ کے حوالہ سے اس بات کو ''الغزالی'' میں نقل کیا ہے :

> غرض ذوقعدہ ۴۹۹ھ میں امام صاحب نے نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں مسند درس کو زینت دی اور بدستور پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہوئے۔(۳)

تعجب ہے کہ ۴۹۹ھ میں مدرسہ نظامیہ نیشاپور میں درس وتدریس کے شغل کے اعتراف کے باوجود پھر علامہ شبلی نعمانی کس طرح اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ امام غزالی ۵۰۰ھ میں اسکندریہ میں تھے کہ ان کو یوسف بن تاشفین کے انتقال کی خبر ملی اور اس خبر کو سن کر انھوں نے یوسف بن تاشفین کے پاس جانے کا ارادہ فسخ کر دیا۔

یہ بھی لحاظ رہے کہ امام غزالی نے المنقذ من الضلال میں بیان کیا ہے کہ وہ بغداد سے ۴۸۸ھ کے آخر یعنی ذی قعدہ میں نکلے تھے اور ۴۹۹ھ میں وہ طوس میں تھے، جیسا کہ انھوں نے خود المنقذ میں بیان کیا ہے، ایسے میں ۵۰۰ھ میں ان کا اسکندریہ میں ہونا اور یوسف بن تاشفین سے ملنے کے لئے افریقہ کے سفر کا ارادہ کرنا اور اس کی موت کی خبر سن کر اس ارادہ سے باز آجانا تاریخی اعتبار سے غلط اور بے بنیاد بات ہے۔

---

(۱) دیکھئے: سير أعلام النبلاء، ط: الرسالة: 19/254، تاريخ الإسلام تبشار: 10/832، الأعلام للزركلي: 8/222۔

(۲) المنقذ من الضلال، ص: 197۔ (۳) الغزالی، ص: 28۔

احیاء العلوم کی تصنیف

علامہ شبلی نعمانی نے احیاء العلوم کے دس سالہ سفر کے دوران تصنیف ہونے سے بعض حضرات کا انکار ذکر کرکے ان کا رد کیا ہے :

> بعض نامور مورخوں نے اس واقعہ کی صحت سے اس بناء پر انکار کیا ہے کہ اس قسم کے سفر میں اس طرز کی کتاب کیوں کر تصنیف کی جاسکتی ہے، بے شبہ امام صاحب جس جذب و بےخودی کی حالت میں سفر کے لئے اُٹھے تھے، اس کے لحاظ سے تصنیف وتالیف کا مشغلہ قیاس میں نہیں آسکتا؛ لیکن زیادہ تحقیق اور کاوش سے معلوم ہوتا ہے کہ دس برس کی مدت میں ان کی حالت یکساں نہیں رہی، مدتوں اگر ان پر جذب ومحویت طاری رہی تو برسوں وہ سلوک کے عالم میں بھی رہے اور اس زمانے میں وہ ہر قسم کے علمی اشغال میں مصروف رہتے تھے۔(۱)

بعض مورخین سے اگر علامہ شبلی نعمانی کی مراد علامہ یافعی ہیں، تو علامہ شبلی نعمانی نے اس موقع پر ان کی ناقص ترجمانی کی ہے، علامہ یافعی صرف یہ نہیں کہتے کہ سفر میں اتنی عظیم کتاب نہیں لکھی جاسکتی، ان کا کہنا یہ ہے کہ دوسال سے بھی کم کی مختصر مدت میں یہ کتاب نہیں لکھی جاسکتی، اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر انھوں نے واقعتاً دوران سفر شام ودمشق کے قیام کے دوران یہ کتاب لکھی ہوتی تو وہ اس کا ذکر المنقذ میں ضرور کرتے، جیسا کہ انھوں نے دیگر کتابوں کا کیا ہے :

> قلت : (اليافعي) وأماقول الذهبي ، انه صنف الاحياء واسمعه بدمشق مخالف لما ذكر الامام ابوحامد المذكور في كتابه (المنقذ من الضلال) أنه أقام في الشام قريباً من سنتين مختلياً بنفسه ولم يذكر اسماعه الاحياء ، ولا تصنيفه ولو كان لذكره كما ذكر علوما اخرى ۔ (۲)

اس کے بعد علامہ یافعیؒ نے ابن کثیر کے اس قول کی تردید کی ہے کہ امام غزالی نے سیر وسیاحت میں دس سال گزارے؛ بلکہ لکھا ہے کہ وہ محض دوسال وہاں رہے اور اس کے بعد پھر حج کرکے دمشق واپس آگئے۔

---

(۱) الغزالی، ص:27۔

(۲) مراۃ الجنان وعبرۃ الیقظان، ترجمہ امام غزالی۔

علامہ یافعی کا خیال ہے کہ امام غزالی نے احیاء العلوم کی تصنیف دمشق وشام کے سفر کے بعد اورطوس میں اقامت اختیار کرنے کے بعد کی ہے؛لیکن علامہ یافعی کا یہ خیال بعض وجوہات کی بناء پر غلط ہے، اوراس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ امام غزالی کے ہم عصر اوران کے شاگرد ابوبکر ابن عربی نے جمادی الآخر ۴۹۰ھ میں بغداد میں ان سے ملاقات کی ہے اوران سے احیاء العلوم کی سماعت کی ہے :

ولقد فاوضت فيها أبا حامد الغزالی حين لقائی له بمدينة السلام فی جمادی الآخرة سنة تسعين و اربع مائة و قد كان راض نفسه بالطريقة الصوفية من سنة ست وثمانين الی ذلک الوقت نحواً من خمسة اعوام وتجرد لها واصطحب مع العزلة ونبذ كل فرقة فتفرغ لی بسبب بيناه فی كتاب ترتيب الرحلة فقرأت عليه جملة من كتبه وسمعت كتابه الذی سماه بالاحياء علوم الدين ـ (۱)

ان کے علاوہ علامہ ابن جوزی نے المنتظم میں بیان کیا ہے کہ احیاء علوم الدین کی تصنیف کی ابتدا بیت المقدس میں ہوئی اور تکمیل دمشق میں ہوئی :

وأخذ في تصنيف كتاب ''الإحياء'' في القدس ، ثم أتمه بدمشق ـ (۲)

اور یہی بات علامہ تغری بردی نے بھی لکھی ہے :

وأخذ فی تصنيف كتابه ''الإحياء'' و تمّمه بدمشق ـ (۳)

اور جیسا کہ علامہ یافعی کی تردید میں گزرا کہ حافظ ذہبی بھی اسی کے قائل ہیں، جب اتنے سارے مورخین اور خود امام غزالی کے شاگرد اس کے معترف ہیں کہ احیاء العلوم کی تصنیف شام ودمشق کے دوران قیام کا ہی نتیجہ فکر ہے تو اس کو نہ ماننے کا کوئی جواز نہیں بچتا اور یہ بات کہ ایک علمی اور فکری ضخیم کتاب مختصر عرصے میں نہیں لکھی جاسکتی، یہ محض قیاس اور ظن وتخمین ہے، جو چشم دید گواہی یعنی ابوبکر ابن عربی کے اعتراف کے بعد کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

(۱) القواصم والعواصم مخطوطہ دار الکتب المصریہ، بحوالہ، مؤلفات الغزالی، ص:546۔

(۲) المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: 17/125۔

(۳) النجوم الزاهرة فی ملوك مصر والقاهرة: 5/203۔

مصر واسکندریہ کاسفر

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا امام غزالی نے مصر واسکندریہ کا سفر کیا تھا، اس کے جواب میں مورخین کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ جن میں سبکی، صفدی، ابن خلکان ودیگر ہیں، نے ان کے مصر واسکندریہ میں قیام کا تذکرہ کیا ہے، دوسرا گروہ جس میں عبدالغافر فارسی، ابن عساکر، ابن جوزی، ذہبی، ابن کثیر وغیرہ ہیں، انھوں نے مصر واسکندریہ کا ذکر نہیں کیا ہے، علامہ شبلی نعمانی اول الذکر گروہ کے ساتھ ہیں؛ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

اسی سفر میں مصر واسکندریہ بھی پہنچے اور اسکندریہ میں مدت تک قیام رہا۔(۱)

دلائل کے لحاظ سے دیکھیں تو موخر الذکر مورخین کی رائے زیادہ مضبوط نظر آتی ہے :

اولاً : تو عبدالغافر فارسی، ابن عساکر، ابن جوزی، اور ذہبی وغیرہ جو امام غزالی کے سب سے قدیم ترجمہ نگاروں میں سے ہیں، انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے؛ بلکہ انھوں نے حج کے بعد خراسان جانے کا ذکر کیا ہے۔

ثانیاً : امام غزالی کی خود اس سفر کی دستاویزی کتاب ''المنقذ من الضلال'' میں مصر واسکندریہ کا کوئی ذکر نہیں ہے؛ حالاں کہ جب انھوں نے شام، دمشق، بیت المقدس وغیرہ کا ذکر کیا ہے تو مصر کا سفر اگر ان کا ہوتا تو وہ ضرور اس کا بھی ذکر کرتے۔

ثالثاً : امام غزالی کی تالیفات میں سے بھی کسی میں کہیں بھول کر بھی مصر واسکندریہ کا ذکر نہیں ہے، جب کہ امام صاحب کی بعض تصنیفات میں دمشق شام اور بیت المقدس میں ان کے قیام کا ذکر ملتا ہے۔

رابعاً : اس وقت مصر میں اسماعیلیوں کی حکومت تھی اور امام صاحب اسماعیلی باطنی فرقہ کے خلاف کئی کتابیں لکھ چکے تھے اور باطنیوں (اسماعیلیوں) کے خلاف لکھی گئی کتاب تو انھوں نے خلیفہ بغداد مستظہر باللہ کے نام معنون بھی کیا تھا، اور اس وقت خلیفہ بغداد اور مصر کے فاطمی حکمرانوں میں حد درجہ عداوت تھی، ایسے میں یہ بعید ہے کہ امام غزالی جیسی معزز اور مشہور شخصیت جن کا خلیفہ بغداد حد درجہ احترام کرتا ہو، اور اسماعیلیوں کے خلاف متعدد کتابیں تصنیف کر چکا ہو، کھلے عام مصر میں داخل ہو اور اسماعیلی حکمراں اس سے کوئی تعرض نہ کریں، ان سب اُمور سے اسی رائے کو تقویت ملتی ہے کہ امام غزالی نے مصر واسکندریہ کا سفر نہیں کیا تھا، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) الغزالی، ص:25۔

مقامِ خلیل پر حاضری

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

۴۹۹ھ میں جب مقامِ خلیل میں پہنچے تو حضرت ابراہیمؑ کے مزار پر حاضر ہوکر تین باتوں کا عہد کیا: (۱) کسی بادشاہ کے دربار میں نہ جاؤں گا، (۲) کسی بادشاہ کا عطیہ نہ لوں گا، (۳) کسی سے مناظرہ نہیں کروں گا؛ چنانچہ مرتے دم تک ان باتوں کے پابند رہے۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی نے ۴۹۹ھ میں مشہد ابراہیم کی زیارت کے بارے میں مکاتیب امام غزالی کا حوالہ دیا ہے؛ لیکن مکاتیب امام غزالی کی مراجعت کے بعد معلوم ہوا کہ وہاں تین باتوں کے عہد کا تو ذکر ہے؛ لیکن سنہ وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔(۲)

بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ اسے ۴۸۹ھ ہونا چاہئے؛ لیکن کتابت کی غلطی سے عدد میں آٹھ کے بجائے نو لکھا گیا اور یوں ۴۹۹ھ ہوگیا، اگر یہ کتابت کی غلطی نہیں ہے تو پھر یہ بھی علامہ شبلی نعمانی کی اس کتاب کے غلط مندرجات میں سے ایک شمار ہوگی؛ کیوں کہ علامہ شبلی نعمانی خود نقل کر چکے ہیں کہ وہ ۴۹۹ھ میں طوس سے نظامیہ نیشاپور جا رہے تھے اور اس سے قبل علامہ شبلی نعمانی لکھ چکے ہیں کہ مشہد ابراہیم سے واپسی کے بعد مکہ مدینہ آئے حج کیا، مکہ میں ایک مدت تک قیام کیا پھر وطن گئے :

بیت المقدس کی زیارت سے فارغ ہوکر مقامِ خلیل گئے، جہاں حضرت ابراہیمؑ کی قبر ہے، پھر حج کی نیت سے مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کا قصد کیا، مکہ میں مدت تک قیام رہا، اسی سفر میں مصر وسکندریہ بھی پہنچے اور اسکندریہ میں مدت تک قیام رہا۔(۳)

سوال یہ ہے کہ اگر ذوقعدہ ۴۹۹ھ میں مدرسہ نظامیہ نیشاپور کو تدریس کی سعادت بخش رہے تھے تو پھر مقام ابراہیم پر کب گئے تھے، حج کب کیا اور مکہ مدینہ میں ایک مدت تک قیام پذیر کب رہے، پھر وہاں سے وطن کب واپس ہوئے اور کتنی مدت کے بعد فخر الملک کو خبر ہوئی اور اس نے اصرار شروع کیا اور آپ نے کتنی مدت کے بعد اس کو قبول کیا، جب کہ اس کے برخلاف ''المنقذ من الضلال'' سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا طوس میں اچھا خاصا قیام ہو چکا تھا اور کافی غور وفکر کے بعد اور صوفیاء حضرات سے مشورہ کے بعد آپ نے نظامیہ نیشاپور میں درس کی ذمہ داری قبول کی۔

---

(۱) الغزالی، ص:26۔　(۲) دیکھئے: مکاتیب امام غزالی، ص:۵، تہران۔　(۳) الغزالی، ص:25۔

دوران سیاحت ذریعہ معاش

علامہ شبلی نعمانی نے الغزالی میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے کہ ان کے دس سالہ سیر وسیاحت اور عزلت وخلوت گزینی کے دوران ان کی گزر بسر کا ذریعہ کیا تھا، امام غزالی نے ''المنقذ من الضلال'' میں اس پر تھوڑی روشنی ڈالی ہے کہ انھوں نے بغداد سے نکلتے ہوئے اپنے مال ومنال کا بیشتر حصہ تقسیم کر دیا اور قلیل مقدار میں مال رکھ لیا جو ان کے اور ان کے اہل وعیال کے گزر بسر کے لئے کافی ہو؛ کیوں کہ عراق سے ہونے والی آمدنی مسلمانوں کے مصالح کے لئے وقف تھی اور پوری دنیا میں ایک عالم کے لئے اس سے زیادہ بہتر مال کوئی نہیں ہوسکتا تھا جس سے وہ اپنے اہل وعیال کی گزر اوقات کا نظم کرے :

> ففارقت بغداد ، وفرقت ما كان معي من المال ، ولم أدخر إلا قدر الكفاف ، وقوت الأطفال ، وترخصاً بأن مال العراق مرصد للمصالح ، ولكونه وقفاً على المسلمين ، فلم أر في العالم مالاً يأخذه العالم لعياله أصلح منه ۔ (۱)

علامہ ابن جوزی نے المنتظم میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ دمشق وشام کی سیر وسیاحت کے دوران کی گزر اوقات کا ذریعہ نسخ وکتابت تھی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام غزالیؒ کتابت کے فن میں بھی طاق تھے :

> ثم إنه ترك التدريس والرئاسة ، ولبس الخام الغليظ ، ولازم الصوم ، وكان لا يأكل إلا من أجرة النسخ ۔ (۲)
>
> پھر انھوں نے تدریس اور جامعہ نظامیہ کی صدارت کو ترک کیا اور موٹا کپڑا پہننا اور برابر روزہ رکھنے لگے اور کتابت کی جو اُجرت ملتی اسی سے گذر بسر کرتے ۔

● ● ●

---

(۱) المنقذ من الضلال، ص:176۔

(۲) المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: 17/125۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ

خالد سیف اللہ رحمانی

اللہ تعالیٰ نے نبوت محمدی کو جوسب سے بڑا اعزاز و امتیاز عطا فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ قیامت تک کے لئے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۔ (الاحزاب:۴۰)

محمد (ﷺ) تم میں سے کسی کے باپ نہیں؛ لیکن اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں۔

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے اپنی انگلیوں کو کھول کر اور بعض روایتوں کے مطابق ملا کر فرمایا: میں اور قیامت اس طرح ہیں ''أنا والساعة كهاتين'' (۱) یعنی میرے اور قیامت کے درمیان کوئی اور نبی نہیں آئے گا اور قیامت تک انسانیت میری ہی نبوت کے زیر سایہ اپنا سفر طے کرے گی۔

اس کے لئے یہ بات بھی ضروری تھی کہ علوم نبوت تسلسل کے ساتھ قیامت تک زندہ رہیں اور اُمت کی نسبت سے نبی کی جو ذمہ داریاں ہیں، وہ انجام پاتی رہیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی کہ دین کا علم اور دین کی خدمت کا سلسلہ کسی وقفہ کے بغیر جاری رہے گا :

يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين، وانتحال المبطلين، وتأويل الجاهلين ۔ (۲)

ہر نسل کے معتبر لوگ اس علم کے حامل بنیں گے، جو غلو کرنے والوں کی تحریف، اہل باطل کی تدلیس اور جاہلوں کی بے جا تاویل سے دین کی حفاظت کریں گے۔

یہ روایت حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ،

---

(۱) مسلم، کتاب الفتن، حدیث نمبر:۲۹۵۱۔

(۲) سنن بیہقی، کتاب الشہادت، حدیث نمبر:۲۰۹۱۱۔

حضرت ابو ہریرہؓ اور بعض دیگر صحابہ سے مروی ہے؛ اگر چہ اس کی سندیں ضعیف قرار دی گئی ہیں؛ لیکن جب ایک ضعیف روایت بہت سی سندوں سے مروی ہو اور موضوع کے درجہ کی نہ ہو تو تعدد طرق کی وجہ سے مقبول ہو جاتی ہے؛ اس لئے بہت سے محدثین نے اس کو 'حسن' کے درجہ میں رکھا ہے، (۱) اس حدیث میں جس علم کی طرف اشارہ ہے، اس سے مراد علم حدیث ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ علماء حدیث سے کار نبوت کو انجام دینے کی خدمت لیں گے۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت علیؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: اے اللہ میرے جانشینوں پر رحم فرمایا ''اللّٰھم ارحم خلفائی''، ہم لوگوں نے دریافت کیا: آپ کے جانشین کون ہیں؟ ارشاد ہوا: وہ لوگ جو میرے بعد آئیں گے، میری سنت اور میری حدیث نقل کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے :

الذین یأتون من بعدی ، یروون أحادیثی وسنتی ویعلّمونها الناس ۔ (۲)

علم حدیث سے شغف رکھنے والوں کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک اور دُعا بھی دی ہے، جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے :

نضّر اللہ امرأ سمع منا شیئاً فبلغه کما سمع ، فرب مُبلّغ أوعی من سامع ۔ (۳)

اللہ اس شخص کو تر وتازہ رکھے، جس نے ہم سے کوئی بات سنی اور جس طرح سنا، اسی طرح دوسروں تک پہنچا دیا؛ کیوں کہ بعض دفعہ جس کو بات پہنچائی جاتی ہے، وہ سننے والے کے مقابلہ زیادہ محفوظ رکھتا ہے۔

علماء اُمت نے شریعتِ اسلامی کو سمجھنے میں حدیث کی اہمیت اور رسول اللہ ﷺ کی دُعاؤں میں شریک وسہیم ہونے کی غرض سے ہمیشہ علم حدیث سے خصوصی شغف رکھا ہے۔

حدیث کی نقل وروایت کی خدمت اس کے ابتدائی عہد میں جس طرح عربوں نے کی ہے، اسی طرح اس کے

---

(۱) إرشاد الساری شرح البخاری للقسطلانی: ۱/ ۴۔

(۲) شرف اصحاب الحدیث للخطیب البغدادی: ۲۱۔

(۳) صحیح ابن حبان: ۱/ ۲۶۸، حدیث نمبر: ۶۶، سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۵۷۔

جمع وتدوین اور اس فن کو اوجِ کمال تک پہنچانے کا سہرا زیادہ تر ایرانی نژاد علماء کے حصہ میں آیا، پھر مصر وشام اور فلسطین ویمن کے علاقوں سے اُٹھنے والے اہل علم نے اس فن کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا ہے، اسی طرح ہندوستان گو جزیرۃ العرب سے دور دراز کا علاقہ ہے؛ لیکن اسے یہ شرف حاصل ہے کہ حضرت عمرؓ کے ابتدائی عہد میں ہی یہاں سے اہل ایمان کا قافلہ حجاز مقدس پہنچ چکا تھا اور بعض تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہی ہندوستان کے ساحلی علاقہ پر اسلام کی روشنی پہنچ گئی تھی، اس دیار نے جہاں مختلف اسلامی اور عربی علوم کی خدمت کی ہے، وہیں حدیث نبوی کی خدمت میں بھی اس کا نمایاں حصہ رہا ہے، اور کیوں نہ ہو کہ یہاں صحابہ وتابعین کا ورود ہوا ہے، صحاح ستہ کے بعض رواۃ یہاں آئے اور یہیں فروکش ہوگئے، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، علامہ عبدالرحمٰن سخاویؒ اور علامہ ابن حجر ہیثمیؒ جیسے نابغۂ روزگار محدثین کے براہ راست تلامذہ کا فیض اس ملک میں جاری ہوا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ علماء ہند کو علوم اسلامی میں حدیث اور فقہ سے زیادہ اعتناء رہا ہے اور ہر دور میں فن حدیث سے شغف رکھنے والے علماء اور شارحین حدیث نے اس فن کی آبیاری کی ہے، گذشتہ پچاس سال میں جن اہل علم نے اس دیار میں حدیث کے چراغ کو روشن کیا ہے، ان میں کئی شخصیتیں ہیں جنھیں عالمگیر شہرت حاصل ہوئی، ان میں ایک اہم نام شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ کا ہے، ۲۵/رجب المرجب ۱۳۵۵ھ، مطابق: ۲/اکتوبر ۱۹۳۷ء کو جونپور (یوپی) کے ایک چھوٹے سے گاؤں چوکیہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی مکتب اور گاؤں کے مدرسہ میں حاصل کی اور فارسی وعربی متوسطات تک مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں میں حاصل کی، یہ مدرسہ حضرت مولانا عبدالحلیم جونپوریؒ کے زیر نگرانی تھا اور یہاں آپ کے خاص مشفق ومربی استاذ مولانا ضیاء الحق فیض آبادی تھے، مولانا جونپوری جن کے بے حد احسان شناس تھے، شوال ۱۳۷۷ھ مطابق مئی ۱۹۵۸ء میں جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہوئے اور وہیں ۱۹۶۰ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور اس کے بعد بھی مزید ایک سال کچھ کتابیں پڑھیں۔

آپ کے اساتذہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ، حضرت مولانا امیر احمد صاحبؒ اور حضرت مولانا منظور خان صاحبؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، آپ اپنے اساتذہ کے محبوب اور مرکز توجہ تھے؛ اس لئے فراغت کے فوراً بعد ۱۹۶۲ء میں معین مدرس مقرر کئے گئے اور تیسرے سال باضابطہ تدریس کی ذمہ داری متعلق ہوئی، حضرت مولانا امیر احمد کاندھلویؒ کی وفات کے بعد ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۹۶۶ء میں پہلی بار مشکوٰۃ المصابیح کا درس آپ سے متعلق ہوا، ۱۳۸۶ھ

مطابق ۱۹۶۷ء سے دورہ کے اسباق آپ سے متعلق کئے گئے، جب شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے مدینہ ہجرت کی اور مستقل طور پر وہاں مقیم ہوگئے تو ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۹۶۹ء میں بخاری شریف کا درس آپ سے متعلق ہوا اور تادم وفات یہ ذمہ داری آپ ہی کے سپرد رہی اور بحیثیت مجموعی پچاس سال بخاری شریف کی تدریس کا شرف حاصل ہوا۔

آپ کا اصلاحی تعلق حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے تھا اور آپ کو اجازت وخلافت اپنے دونوں بزرگوں حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے حاصل تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائی اور آپ نے اپنی زندگی کی ۸۰ سے زیادہ بہاریں دیکھیں، ۱۶ر شوال المکرم ۱۴۳۸ھ مطابق: ۱۱ر جولائی ۲۰۱۷ء بروز منگل قریب نو سوا نو بجے صبح آپ کی وفات ہوئی، صاحبزادہ گرامی حضرت مولانا طلحہ کاندھلوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور کہا جاتا ہے کہ نماز جنازہ میں ایسا جم غفیر ہوا کہ سہارنپور میں اتنا بڑا جنازہ کسی اور صاحب کا نہیں دیکھا گیا، غالباً دو کلومیٹر تک شرکاء جنازہ کا جلوس تھا اور لوگوں نے پانچ لاکھ سے بھی زیادہ کی تعداد کا اندازہ کیا ہے۔

راقم الحروف کی چوں کہ پوری تعلیم جامعہ رحمانی مونگیر میں ہوئی اور آخری سال دارالعلوم دیوبند میں مکرر دورۂ حدیث کی سعادت حاصل ہوئی؛ اس لئے آپ سے تلمذ کا شرف حاصل نہیں ہوسکا، نیز غائبانہ تو ہمیشہ لوح قلب پر آپ کی علمی عظمت کا نقش ثبت رہا؛ لیکن ملاقات کی نوبت کم ہی آسکی، میرے والد ماجدؒ مجھے خط کے ذریعہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی موقع نکل آئے سہارنپور جا کر حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی مجلس میں بیٹھو اور حضرت سے مصافحہ کرنے کی کوشش کیا کرو، اس وجہ سے میں گاہے گاہے سہارنپور حاضر ہوتا تھا، اس وقت حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ مفلوج ہوچکے تھے اور وہیل چیئر پر بیٹھائے جاتے تھے، ایک طرف آپ کا ہاتھ رکھا ہوتا تھا، لوگ آگے بڑھ کر مصافحہ کرتے رہتے تھے، عصر بعد کی مجلس میں کوئی کتاب پڑھ کر سنائی جاتی تھی، ایک دن جمعرات کو جب حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت شیخ الحدیثؒ کے سامنے جو حلقہ بنا ہوا ہے، اس میں بالکل شروع میں دائیں جانب ایک صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، رنگ بہت کھلا ہوا، بال بالکل سیاہ، سر پر سفید عمامہ، چھریرہ بدن، چہرہ نہایت روشن، کشادہ پیشانی اور پورا وجود ایسا کہ گویا نور کا ٹکڑا ہو، بار بار نگاہ اسی شخصیت کی طرف اُٹھتی اور دل کو کشش ہوتی، یہ بات ۹۶-۱۳۹۵ھ، مطابق: ۷۶-۱۹۷۵ء کی ہے، میں نے ایک صاحب سے دریافت کیا: یہ کون صاحب ہیں؟ انھوں نے حیرت سے پوچھا، تم ان کو نہیں جانتے؟ یہی ہیں حضرت مولانا یونس جونپوری جو بخاری کا درس دیتے ہیں، پھر جب حضرت شیخ الحدیث کے یہاں مسلسلات کا درس ہوا، تو آپ ہی نے حدیث کی عبارت پڑھی، اجازت تو

حضرت مولانا زکریا صاحبؒ نے عطا فرمائی ؛ لیکن اس طرح حضرت مولانا یونس صاحب سے سماعت حدیث کا شرف حاصل ہوگیا۔

پھر ایک بار ایسا ہوا کہ حیدرآباد کی ایک اہم دینی درسگاہ میں ذمہ داروں نے ختم بخاری شریف کے لئے آپ کو دعوت دی، اس وقت آپ کے لطافت مزاج کا بھی اندازہ ہوا، منتظمین نے جلسوں کے عام مزاج کے مطابق آپ کے درس کا وقت اخیر میں رکھا تھا اور پہلے بہت سارے خطابات رکھ دیئے تھے، یہ بات آپ کو ناگوار ہوئی اور فرمایا کہ میں وقت زوال سے پہلے ہی درس دوں گا ؛ چنانچہ جلسہ گاہ میں پہنچ گئے ؛ حالاں کہ موسم گرم تھا ؛ لیکن پھر بھی علالت طبع کی وجہ سے گرم شال اوڑھ کر درس دیا، جب درس دینا شروع کیا تو کہیں سے کسی بیماری کا احساس نہیں جھلکتا تھا، صفات باری پر بڑی تفصیل سے اور بہت اچھی گفتگو فرمائی، دوران درس استشہاد کے طور پر بعض طویل حدیثیں پیش فرمائیں اور بے تکلف اس کا متن پڑھتے گئے، یہ پہلا اور آخری موقع تھا، جب اس حقیر نے براہ راست درس سنا، محظوظ بھی ہوا اور متاثر بھی، اس وقت تک مولانا کی تقریر بخاری کی طباعت شروع نہیں ہوئی تھی اور اس کا بھی علم نہیں تھا کہ بعض تلامذہ اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ آپ کے دروس کو ضبط تحریر کیا جانا چاہئے اور اختصار کے بغیر پورا درس قلم بند ہونا چاہئے، تو ازراہ تواضع فرمایا کہ یہ تو ختم بخاری کی تقریر ہے، ہر درس اس طرح کا تھوڑا ہی ہوتا ہے!

آپ کے ایک شاگرد حضرت مولانا مفتی عبدالودود مظاہری میرے دیرینہ اور خاص دوستوں میں ہیں اور دارالعلوم سبیل السلام میں استاذ ہیں، وہ پڑھنے کے زمانہ ہی سے ممتاز تھے، حضرت مولانا محمد رضوان القاسمیؒ اور ہم لوگوں نے مفتی صاحب سے گذارش کی کہ حضرت کو کسی طرح سبیل السلام بھی لایا جائے ؛ چنانچہ مفتی صاحب کی کوشش سے آپ نے دعوت قبول فرمائی اور اگلے دن تشریف لائے، استقبال کا انتظام دفتر نظامت میں تھا ؛ لیکن آپ نے سیدھے لائبریری میں آنا پسند کیا اور وہاں دیر تک بیٹھے رہے، لائبریری پر ایک نظر ڈالی، پھر مختلف کتابوں کے بارے میں دریافت فرمایا کہ فلاں فلاں کتاب ہے؟ بعض کتابیں تھیں اور بعض نہیں تھیں، اس زمانہ میں حضرت مولانا محمد رضوان صاحبؒ کویت اور امارات وغیرہ کا سفر کرتے اور میں سعودی عرب جاتا تھا اور ہر سال منتخب کتابیں خرید کر لائی جاتی تھیں، میں خاص طور پر اہم علمی موضوعات پر دکتورہ کی بحوث اور نئے تحقیق شدہ مطبوعات لانے کی سعی کرتا تھا، مجھ سے فرمایا: کچھ نئی کتابیں دکھایئے، میں نے متون حدیث، رجال، اُصول حدیث وغیرہ کی کئی کتابیں پیش کیں ؛ لیکن دکتورہ کے ایک دو مقالات کے علاوہ سبھوں کے بارے میں فرماتے رہے کہ یہ میری لائبریری میں موجود ہے، یا یہ میری نظر سے گذر چکی ہے، جو لوگ ان کے کتب بینی اور کتابوں کی خریداری کے ذوق سے واقف ہیں، ان کے لئے ہرگز یہ بات قابل حیرت نہیں تھی۔

کچھ عرصہ پہلے ہی دارالعلوم سبیل السلام سے میری کتاب ''حلال وحرام'' شائع ہوئی تھی، جب مولانا یہاں سے مدرسہ فیض العلوم جانے لگے تو مولانا محمد رضوان صاحبؒ نے ان کو اس کتاب کا ایک نسخہ پیش کیا، مولانا نے ایک دو صفحات پلٹ کر ہاتھ میں رکھ لیا اور غالباً جاتے ہوئے راستہ میں اس پر طائرانہ نظر ڈالی، جب مدرسہ فیض العلوم پہنچے تو وہاں سے ایک صاحب کے ذریعہ فون کرایا کہ مجھے قیمتاً اس کتاب کے مزید پانچ نسخے چاہئیں، میں بعض احباب کو دینا چاہتا ہوں، مولانا محمد رضوان صاحبؒ نے ہدیتاً پانچ نسخے بھجوادیئے، اس بات سے مجھے جو مسرت ہوئی، اس کو الفاظ کا پیکر دینا مشکل ہے۔

پھر دو بار سہارنپور آپ کے درِ دولت پر حاضری ہوئی، آپ کا حجرہ ایسا تھا کہ گویا اینٹوں کی بجائے کتابوں کی دیوار تعمیر کر دی گئی ہو، حدیث اور رجال کی کتابیں تو تھیں ہی، اس کے علاوہ بھی ہر فن کے اہم مراجع موجود تھے، میں ان کی گفتگو بھی سنتا جاتا تھا اور دُزدیدہ نگاہوں سے کتابوں کے نام بھی پڑھتا جاتا تھا، ایسا انتخاب تھا کہ دینی جامعات کی بڑی بڑی لائبریریاں بھی اس کے آگے مات ہیں، جہاں آپ بیٹھے ہوئے تھے، وہاں بھی چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں، اگر علم کے پروانے کے سامنے کتابوں کی شمع روشن نہ ہو تو کونسی شمع روشن ہوگی!

ان دو ملاقاتوں میں سے ایک میں ایک دلچسپ بات پیش آئی، جو شاگردوں کے ساتھ آپ کی بے تکلفی اور شفقت ومحبت پر مبنی ہے، آپ کے ایک نوجوان شاگرد آئے، مصافحہ کرتے ہوئے آپ نے ان سے پوچھا: کہاں کے ہو؟ انھوں نے کہا: بستی کا ہوں، کہنے لگے: بستی کے لوگ بڑے بدمعاش اور جھگڑالو ہوتے ہیں، پھر ایک اور صاحب آئے، مصافحہ کرتے ہوئے سن فراغت پوچھا، پھر دریافت کیا: کہاں کے رہنے والے ہو؟ نوجوان نے کہا: بہار کا ہوں، کہنے لگے: بہار کے لوگ بڑے خود پسند ہوتے ہیں، پھر ایک اور شاگرد پہنچے، مصافحہ کرتے ہوئے ان سے بھی پوچھا: کہاں کے رہنے والے ہو؟ انھوں نے کہا: بنگال کا، کہنے لگے آج تو 'ب' ہی 'ب' ہے، بنگال کے لوگ تو اعجب الخلائق ہیں، مولانا کی اس بات پر میں بہت مشکل سے اپنی ہنسی روک پایا، اس کو اس پس منظر میں دیکھنا چاہئے کہ وہ اپنے شاگردوں پر بے حد شفیق تھے اور ملاطفت کے طور پر اظہار بے تکلفی کے لئے ایسے فقرے کہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے اس طرح کے تبصرے سن کر طلبہ ناراض نہیں ہوتے تھے؛ بلکہ خوش اور لطف اندوز ہوتے تھے۔

اسی سفر میں یا ایک اور سفر میں جب میں نے اپنا نام بتایا تو پہچان گئے اور فرمایا: میں نے آپ کے مضامین پڑھے ہیں، بظاہر ''سہ ماہی بحث ونظر'' کے مضامین نظر سے گذرے ہوں گے، پھر کچھ حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہنے لگے: ''ہر عمل میں اخلاص ہونا چاہئے اور اس پر خصوصی توجہ دینی چاہئے، اگر اخلاص نہ ہو تو بڑا سے بڑا عمل بھی بے کار ہے، علماء کو اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے''۔

حضرت مولانا محمد یونس صاحبؒ نے افراد کی تصنیف پر زیادہ توجہ دی اور مطالعہ نیز تدریس میں آخری درجہ اشتغال کی وجہ سے تصنیف وتالیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں کر سکے؛ لیکن بعض بڑے اہل علم کے ساتھ یہ ہوتا رہا ہے کہ ان کے شاگردوں نے اپنے استاذ کے افادات کو مرتب کر کے ان کے علم کو زندگی بخشی ہے، انھیں زندہ رکھا ہے، یہی صورت حال آپ کے ساتھ بھی پیش آئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے بعض شاگردوں اور خاص کر حضرت مولانا محمد ایوب سورتی زید مجدہ کو آپ کے افادات مرتب کرنے کی توفیق عطا فرمائی، انھوں نے آپ کی مختلف نادر تحقیقات وتخریجات کو —— جو زیادہ تر اہل علم کے جوابات ہیں —— کو ''الیواقیت الغالیہ فی تحقیق وتخریج الاحادیث العالیہ'' کے عنوان سے مرتب کیا ہے، اسی طرح بخاری کے ابتدائی حصہ کا 'کتاب الایمان' اور بخاری کے آخری حصہ 'کتاب الاقرار تا ختم بخاری' دو جلدوں میں 'الفیض الباری' کے نام سے مرتب کیا ہے، اسی طرح اپنے استاذ کی یادداشت سے استفادہ کرتے ہوئے 'نبراس الساری فی ریاض البخاری' کے نام سے شیخ کے درسی افادات کو عربی میں مرتب کرنا شروع کیا ہے، اسی طرح آپ کے بعض تلامذہ نے آپ کے نادر حدیثی وفقہی تحقیقات کو نوادر الحدیث اور نوادر الفقہ کے نام سے جمع کیا ہے، ان کے علاوہ خود آپ کے قلم سے بھی بعض رسائل ہیں، جو 'یواقیت'' میں شامل ہیں۔

برصغیر میں عام طور پر درس حدیث میں پوری توجہ 'فقہ الحدیث' پر ہوتی ہے؛ لیکن آپ کی تقریر فقہ الحدیث تک محدود نہیں ہوتی تھی؛ بلکہ رجال، احکام اور فوائد سب پر ہوتی تھی، ضمنی طور پر حدیث کے اُصول پر بحث کرتے تھے، شارحین کے درمیان محاکمہ بھی ہوتا تھا، نیز اگرچہ آپ فقہ حنفی کے متبع تھے اور زیادہ تر اسی کے مطابق عمل کرتے تھے؛ لیکن آپ کا ذوق ومزاج ولی اللہی تھا اور احادیث کی روشنی اگر کسی مسئلہ میں دوسری رائے کی طرف رجحان ہوتا تو اس کو ترجیح دیتے تھے، آپ کے تلامذہ کا بیان ہے کہ بہت سے مسائل میں فقہ شافعی اور فقہ حنبلی کی طرف آپ کا جھکاؤ ہوتا تھا؛ بلکہ بعض مشہور مسائل جیسے رفع یدین، آمین بالجہر، قرأت فاتحہ خلف الامام میں شوافع کے نقطۂ نظر کو ترجیح دیتے تھے، پانی کی طہارت ونجاست کے سلسلہ میں مالکیہ کے قول کو راجح اور اقرب من الحدیث خیال کرتے تھے، ''إنما الاعمال بالنیات'' کے تحت وضو کے لئے نیت کو شرط قرار دیتے تھے، اس طرح کی بہت سی مثالیں آپ کے درسی افادات اور حدیثی وفقہی تحقیقات میں ملتی ہیں، نیز بعض مسائل میں جزوی طور پر دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے دوسرے نقطۂ نظر کے اختیار کرنے کو تقلید کے مغایر بھی نہیں سمجھتے تھے؛ چنانچہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں :

> آپ کے اس کلام (سوال) میں ایک بات قابل تنبیہ تھی، وہ یہ کہ اگر کوئی اس صورتِ جلوس کا قائل نہیں ہوتا تو ترکِ تقلید کا اعلان کرے۔
>
> محترم! یہ عجیب بات کہہ دی، اگر کوئی کسی کی ہر بات میں موافقت کرتا ہو اور اتفاق سے ایک یا دو باتوں میں جو اس کے نزدیک اولیٰ وارجح ہیں، اگر موافقت

نہ کرے، تو کیا ایسے شخص کو اس کا مخالف قرار دیں گے؟ ہرگز نہیں، اس قسم کا اختلاف تو باپ اور بیٹوں میں ہوا کرتا ہے، استاذ اور شاگرد میں ہوتا ہے، مگر اس کو مخالفت سے تعبیر نہیں کرتے ہیں۔

اگر اتفاق سے اتباع امام نے امام صاحبؒ سے بعض مسائل میں دلائل کی وجہ سے مخالفت کی ہے تو یہ متابعت کے خلاف نہیں ہے، آخر حضرات صاحبین نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کی کتنے مسائل میں مخالفت کی ہے، پھر کوئی ان کے بارے میں یہ خیال رکھتا ہے کہ وہ امام صاحب کے خلاف ہیں؟

میرے کہنے کا حاصل یہ ہے کہ ایک دو نہیں؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ مسائل میں اگر کوئی مخالفت کرے اور دلیل کے تابع ہو کر کرے تو یہ مخالفت امام نہیں ہے۔

آخر سجدۂ شکر کے امام صاحبؒ قائل نہیں ہیں؛ لیکن صاحبینؒ اس کے قائل ہیں:

كما في شرح السير الكبير (ج:۱/۱۴۸) قال صاحب الدر المختار: سجدة الشكر مستحبة، به يفتى، قال شيخ مشائخنا مولانا الگنگوهي في الكوكب (ج: ۱/۴۱۸) لم يقل بجوازها الإمام الهمام ولعله لم يجد الرواية، والمذهب جوازها وهو قول صاحبيه، انتهى، قال في شرح المنية: والمعتمد أن الخلاف في سنيتها لا في الجواز، قال في الحلية: والأظهر أنها مستحبة كما نص عليه محمد لأنها قد جاء فيها غير ما حديث، وفعلها أبوبكر وعمر وعلي، فلا يصح الجواب عن فعله صلى الله عليه وسلم بالنسخ۔

اسی طرح امام صاحبؒ سے اشعار کی کراہت منقول ہے؛ لیکن صاحبینؒ اس کے قائل ہیں، اگرچہ ظاہر یہی ہے کہ امام صاحبؒ نے اپنے زمانہ کے اشعار کو مکروہ سمجھا ہے کہ بہت مبالغہ کرتے تھے، حتیٰ کہ سرایت زخم کا خطرہ ہوتا تھا: ''كما قاله الطحاوي والشيخ أبو منصور الماتريدي''۔

یہاں مقصد یہ ہے کہ بعض مسائل بظاہر امام صاحب سے منقول ہیں اور صاحبین اس کے خلاف کے قائل ہیں؛ بلکہ بعض میں تو صاحبین ہی کے قول پر فتویٰ ہے اور ۱۷ یا ۲۰

مسائل تو ایسے ہیں کہ امام زفرؒ کے قول پر فتویٰ دیا گیا ہے؛ لیکن کوئی بھی اس سبب سے حنفیت سے خارج نہیں ہوا؛ بلکہ بعض محققین کی تو یہ رائے ہے کہ اگر محقق کو کوئی بات دلائل کی روشنی میں احادیث کے مطابق معلوم ہو اور وہ امام صاحب کے قول کو چھوڑ دے تو یہ خلافِ تقلید امام نہیں ہے، اس لئے کہ خود امام صاحب کا ارشاد ہے: ''إذا صح الحدیث فھو مذھبی''۔

قال ابن عابدین (ج:۱/۴۶) ناقلاً عن العلامة البیری فی أول شرحه علی الأشباہ عن شرح الھدایة لابن الشحنة ونصه: إذا صح الحدیث وکان علی خلاف المذھب عمل بالحدیث ویکون ذٰلک مذھبه، ولا یخرج مقلدہ عن کونه حنفیاً بالعمل به، فقد صح عنه أنه قال: إذا صح الحدیث فھو مذھبی، وقد حکی ذٰلک ابن عبد البر عن أبی حنیفة وغیرہ من الأئمة، ونقله أیضاً الإمام الشعرانی عن الأئمة الأربعة، ولا یخفی أن ذٰلک لمن کان أھلاً للنظر فی النصوص ومعرفة محکمھا من منسوخھا، فإذا نظر أھل المذھب فی الدلیل وعملوا به صح نسبته إلی المذھب لکونه صادراً بأذن صاحب المذھب إذ لا شک أنه لو علم ضعف دلیله رجع عنه واتبع الدلیل الأقویٰ۔ (۱)

شیخ کی یہ بات بڑی اہم ہے اور علم وتحقیق کی دنیا میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ بعض اکابر اہل علم نے ایک مذہب فقہی پر عمل کرنے کے باوجود بعض مسائل میں دلیل کی بنیاد پر دوسرے نقطۂ نظر کو اختیار کیا ہے، خود علماء ہند میں شاہ ولی اللہ صاحب اور مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کے یہاں اس سلسلہ میں جو توسع پایا جاتا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں ہے؛ لیکن اس کے علاوہ بھی اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، جیسے حضرت شاہ نظام الدین اولیاء اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے شاگرد سید جلال الدین بخاری صلاۃ الجنازہ عن الغائب اور قرأۃ فاتحہ خلف الامام کے قائل تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا فتویٰ جمعہ فی القریٰ میں جواز کا ہے، تشہد میں اشارہ کے سلسلہ میں انھوں نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ ختم تشہد تک انگشت شہادت اُٹھائی ہوئی حالت میں رکھی جائے، جمع بین الصلاتین کے سلسلہ میں عذر کی بنا پر جواز کی رائے ہے، علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کا رجحان بھی مختلف مسائل میں صاف طور پر

(۱) الیواقیت الغالیہ:۱/ ۹۴-۹۵۔

بمقابلہ احناف کے ظاہر حدیث کی طرف نظر آتا ہے، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے بھی اعلاء السنن میں بعض مسائل میں حدیث کی بنا پر دوسرے نقطۂ نظر کو اختیار کیا ہے، خود موجودہ دور کے بعض حنفی علماء فقہ وحدیث کے یہاں ایسی مثالیں مل جائیں گی، جیسے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی نصاب شہادت فراہم نہ ہونے کی صورت میں صرف ایک گواہ اور قسم کی بنا پر فیصلہ کے قائل ہیں، (۱) اسی طرح علت ربا میں مالکیہ کے مسلک کو راجح سمجھتے ہیں، (۲) جدید مالیاتی مسائل میں تو بہت سے مسائل میں ان کا نقطۂ نظر احناف کے برخلاف ہے؛ اس لئے جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے تقلید عامی اور تقلید عالم میں فرق کیا ہے، وہ سلف صالحین کا معمول رہا ہے اور اسی پر حضرت مولانا محمد یونس صاحبؒ کا عمل تھا۔

آپ جہاں کہیں احادیث، شخصیات یا نظریات پر گفتگو کرتے ہیں، محدثانہ شان کے ساتھ کرتے ہیں، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف منسوب ہے کہ انھوں نے احناف کو مرجیہ قرار دیا ہے اور علماء نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں، شیخ یونس صاحبؒ نے اکثر جوابات پر رد کیا ہے اور اس طرف رجحان ظاہر کیا ہے کہ اس میں سارے حنفیہ مراد نہیں ہیں؛ بلکہ صرف وہ لوگ مراد ہیں، جو فروعی مسائل میں امام ابوحنیفہ کی آراء کے پابند تھے اور عقیدہ کے اعتبار سے مرجی تھے، آج کل اپنے ممدوح بزرگوں کی تائید ومدح میں جو غلو کیا جاتا ہے، اس پس منظر میں آپ کا یہ اقتباس پڑھنے کے لائق ہے :

> اس کے بعد یہ سمجھئے کہ ہم نے پیرانِ پیر کو بزرگ اور شیخ جانا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے غلطی نہیں ہوسکتی ہے؛ لہٰذا اس امر میں ہم ان کے متبع نہیں ہیں؛ لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ پیرانِ پیر کا دامن ہی ہاتھ سے چھوٹ جائے، ایک آدھ بات میں اختلاف نہ اعتقاد ہی میں مخل ہے اور نہ ہی اتباع میں، یہ تو صرف انبیاء کی شان ہے کہ ان کی ہر بات میں اطاعت کی جائے اور ہر امر پر اعتقاد رکھا جائے، واللہ اعلم۔

انسان کی شخصیت اور فکر ونظر کی تعمیر میں ان شخصیتوں کا بڑا دخل ہوتا ہے، جن سے وہ متاثر ہوا ہو، یہ متاثر کن شخصیتیں اساتذہ کی بھی ہوسکتی ہیں اور گذشتہ اہل علم اور مصنفین کی بھی، اگر اس پہلو سے حضرت مولانا محمد یونس صاحبؒ کی تحقیقات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقہاء مجتہدین میں امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ سے زیادہ متاثر تھے، محدثین میں ان کو امام بخاریؒ سے عشق ہے، شارحین حدیث میں حافظ ابن حجرؒ کا درجہ ان کے یہاں بہت فائق ہے اور وہ علامہ زیلعیؒ کے بھی بڑے قدرداں ہیں، اسلامی مفکرین میں علامہ ابن تیمیہؒ نے انھیں بہت متاثر کیا ہے، یوں

(۱) دیکھئے: تکملہ فتح الملہم: ۲/ ۵۸۲۔ (۲) تکملہ فتح الملہم: ۱/ ۵۸۲۔

توکسی صاحبِ نظر عالم کی فکر سازی میں بہت سے اہل علم کا حصہ ہوتا ہے؛ لیکن بعض شخصیتیں اپنا زیادہ اثر ڈالتی ہیں، اس پہلو سے دیکھا جائے تو یہ شخصیتیں مولانا کی فکر سازی میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔

شیخ کے افادات کا مجموعہ 'الیواقیت الغالیۃ' جو آپ کے جوابات اور حدیث کی بعض بحوث پر مشتمل ہے، واقعی اسم بامسمی ہے اور یہ اسی انداز کی کتاب ہے جیسے سخاوی کی 'المقاصد الحسنۃ' محدثین کی شان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان کو سنت کی غیر معمولی محبت ودیعت کی تھی، وہ اتباع سنت کو دین اور تصوف کا خلاصہ قرار دیتے تھے، درود شریف کی کثرت رکھتے تھے، ہمیشہ باوضو حدیث بیان کرتے تھے، صحیح بخاری کو خود امام بخاریؒ کے نقطۂ نظر سے پڑھاتے تھے، نہ کہ کسی خاص مسلک اور کسی خاص شارحِ حدیث کے نقطۂ نظر سے۔

شیخ کی تحریروں میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ انھوں نے مذاہب فقہ کو نقل کرنے میں متاخرین سے زیادہ متقدمین کی نقل پر اعتماد کیا ہے، فقہ حنفی کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے میں زیادہ تر امام محمدؒ اور ان کے بعد کے اصحاب میں ابو اللیث سمرقندیؒ سے استفادہ کرتے ہیں اور اگر حنفیہ کا قول مشہور ظاہر حدیث کے خلاف ہو اور کوئی قول ظاہر حدیث کے مطابق ہو تو اس دوسرے قول کو خاص طور پر ذکر کرتے ہیں اور اسی کو ترجیح دیتے ہیں؛ لیکن اپنی تحقیق پر نہ فتویٰ دیتے تھے اور نہ دوسروں کو اس پر عمل کی تلقین کرتے تھے، یہی اہل علم کی شان ہے کہ جن مسائل میں ایک سے زیادہ رایوں کی گنجائش ہے، ان میں اپنے مستفیدین کے حلقہ میں اپنی تحقیق پیش کرے، اپنے انشراح کے مطابق خود عمل کرے؛ لیکن اس طرح کہ اس کی تبلیغ نہ کرے، جو انتشار واختلاف کا سبب بن جائے۔

غرض کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے عہد کے بڑے محدث تھے، فقہی اختلاف پر گہری نظر رکھتے تھے، امام بخاری کے گویا عاشق تھے، حدیث کی تحقیق میں مقلد محض نہیں تھے؛ بلکہ حسبِ ضرورت مستقل طور پر اپنی رائے قائم کرتے تھے، فقہی تعصّبات سے بالاتر ہو کر اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے تھے اور جب کوئی بات قابل نقد محسوس ہوتی تو چاہے فقہاء مجتہدین ہوں یا اکابر محدثین اور اپنے اساتذہ، پورے احترام اور عدل واعتدال کے ساتھ ان پر نقد کرتے تھے، جس میں نہ عناد کا شائبہ ہوتا اور نہ غلو کا۔

جس وقت آپ کی وفات ہوئی، یہ حقیر سری لنکا میں تھا، وہاں عزیزی مولانا محمد طیب مظاہری سلمہ میرے میزبان تھے، جو مظاہر علوم میں پڑھ چکے تھے اور جن کو آپ سے استفادہ کا شرف حاصل ہو چکا تھا، اس خبر نے ہم سب کو بڑا صدمہ پہنچایا، اس دن اور اس کے بعد مختلف شہروں میں متعدد مدارس کا دورہ ہوا، ہر جگہ علماء رنجیدہ اور سوگوار تھے، اندازہ ہوا کہ ان کی محبت کا نقش ہر صاحب علم کے دل پر ثبت ہے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

غفر اللہ لہ ورفع درجاتہ وکثّر امثالہ، آمین یا رب العالمین۔

● ● ●

فتاویٰ

مفتی اشرف علی قاسمی ☆

سسرالی رشتہ داروں کی خدمت

سوال:- میری بیٹی کی شادی کو کئی سال ہو گئے، اس پوری مدت میں میری بیٹی کبھی بھی سسرال میں خوش نہیں رہی، ہمیشہ اذیت ناک زندگی گزارتی رہی، سسرال والے اور شوہر کسی نہ کسی بات پر ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، شوہر بہت زد وکوب کرتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ تم کو میرے ماں باپ، بہن بہنوئی کی خدمت کرنی پڑے گی، چاہے وہ گالیاں دیں اور بُرا بھلا کہیں، ان کے کپڑے اور سارے گھر کے برتن صاف کرنے کی ذمہ داری میری کمزور بیٹی پر ہے، میرا سوال یہ ہے کہ کیا شریعت میں ساس، سسر، نند، نندوئی کی خدمت کی ذمہ ساری گھر کی بہو پر ہے یا نہیں؟ (عبدالکریم، شاہین نگر)

جواب:- جواب سے قبل آپ کو اسلام کے نظام معاشرت بالخصوص ازدواجی زندگی کے شرعی احکام سمجھنے کی ضرورت ہے، معاشرتی اور سماجی زندگی ازدواجی زندگی ہی سے متعلق ہے، اسی سے خاندان وجود میں آتا ہے اور اسی خاندان سے سماج اور معاشرت کی تشکیل ہوتی ہے؛ اس لئے جیسی ازدواجی زندگی ہوگی، سماج بھی ایسا ہی ہوگا، ازدواجی زندگی کے بارے میں اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مرد وعورت باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں، فریق نہیں، ان کے درمیان آقا اور باندی کا رشتہ نہیں؛ بلکہ ایک معاملہ کے رفیق وشریک ہیں، عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں، تو مردوں کے حقوق بھی عورتوں پر ہیں، بیوی پر شوہر کے حقوق یہ ہیں کہ بیوی معروف میں شوہر کی اطاعت کرے، اپنی عصمت کی حفاظت کرے، شوہر کے مال، جائیداد اور گھر کی حفاظت کرے، بچوں کی تربیت ونگہداشت کرے، شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہ نکلے۔

☆ معتمد اُمور انتظامی: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

فقہاء نے جو ذمہ داریاں عورت پر ڈالی ہیں، ان میں قانونی اعتبار سے کہیں بھی ان کی خدمت واجب نہیں لکھی، نند، نندوئی، بھائی، بھاوج کی خدمت واجب نہیں؛ لیکن اخلاقی طور پر شوہر کے والدین کی خدمت اس کے ذمہ ہے، یہ دراصل شوہر ہی کی خدمت ہے، اس لئے کہ شوہر اپنی بیوی اور اولاد کی کفالت کی کوشش میں لگا رہتا ہے، اس لئے عورت کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کے والدین کی خدمت بھی کرے؛ البتہ شوہر کے بھائی، بہن کی خدمت واجب نہیں۔

بینک میں جمع رقم کے سود کا رشتہ داروں کی اعانت میں استعمال

سوال:- (۱) میرے اکاؤنٹ میں جو رقم جمع ہے، اس پر جو سود ملتا ہے؛ چوں کہ وہ حرام ہے، اس لئے میں نے اس کو اب تک نہیں نکالا ہے؛ لیکن میرے بعض رشتہ دار بہت مقروض ہیں اور تنگی میں زندگی گزار رہے ہیں، کیا میں ان کو سود کی یہ رقم کو دے سکتا ہوں، کہیں یہ گناہ تو نہیں؟

(۲) ان رشتہ داروں کے علاوہ اور کسی مصرف میں سود کی رقم کیا استعمال کی جاسکتی ہے؟ (محمد احمد، ایرہ کٹنہ)

جواب:- بینک میں جمع کی ہوئی رقم پر ملنے والا نفع سود ہے، سود نہ صرف حرام ہے؛ بلکہ بہت سخت گناہ ہے، اس لئے ذاتی استعمال کرنا تو جائز نہیں؛ لیکن بینک میں چھوڑ دینا بھی مسلمانوں کے لئے باعث ضرر ہے، اس لئے ایسی رقم بینک سے نکال کر بلا نیت صدقہ ضرورت مندوں، فقراء ومساکین پر خرچ کر دینا چاہئے، اس سلسلہ میں عام فقراء ومساکین کی طرح اپنی اولاد اور ماں باپ دادا دادی کے علاوہ بھائی، بہن اور اس طرح کے دیگر رشتہ داروں کی سود کی رقم سے مدد کی جاسکتی ہے؛ بلکہ ان کی امداد میں زیادہ ثواب ہے، ایک تو سود سے بچنے کے حکم پر عمل بھی ہو جائے گا اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی بھی ہوگی، مسلم شریف کی روایت میں ہے: ''لهما اجران : اجر القرابة واجر الصدقة''۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۲۳۱۸)

اجتماعی ختم قرآن وایصالِ ثواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے یہاں جب کوئی انتقال کر جاتا ہے، تو اس کے لئے اجتماعی طور پر ختم قرآن کے ذریعہ ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے، اجتماعی طور پر تلاوت قرآن کرنا اور پھر میت کو اس کا ثواب پہنچانا کیسا ہے؟ (حمید اللہ خان، چندرائن گٹہ)

جواب:- مرحوم کے لئے ایصالِ ثواب کی نیت سے کچھ لوگوں کو جمع کر کے ایک یا دو قرآن مکمل کرا کے ایصالِ ثواب کر دیا جائے یہ جائز ہے؛ لیکن اس کے لئے شرط ہے کہ اس کے پیچھے کوئی عوض نہ ہو، کھانا کھلانا یا نقد روپیہ دینا وغیرہ شامل نہ ہو، اگر اس کے پیچھے عوض ہو تو پھر جائز نہیں، علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ جب پیسے لے کر اس نے تلاوت کیا تو خود اس کو ثواب نہیں ملا، جب خود اس کو ثواب نہیں ملا تو دوسرے کو ثواب کیسے دے سکتا ہے؟ اس لئے کسی لالچ اور عوض کے بغیر تلاوت کرا کر ثواب پہنچایا جائے تو جائز ہے۔

تبلیغی جماعت اور سفر کا حکم

سوال:- تبلیغی جماعت میں جب لوگ چلہ کے لئے نکلتے ہیں تو کبھی مسافت سفر سے کم کی مسافت پر نکلتے ہیں، کبھی مسافت سفر سے زیادہ دُور کے لئے نکل جاتے ہیں؛ لیکن ایسا ہوتا ہے کہ روزانہ کا قیام کبھی اس محلہ کی مسجد میں، کبھی اُس محلہ کی مسجد میں ہوتا ہے، تو وہ جماعت مقیم شمار ہوگی یا مسافر؟ (محمد فیاض، ملک پیٹ)

جواب:- آپ نے جو صورت پوچھی ہے، اس میں وہ جماعت مقیم شمار ہوگی؛ چوں کہ وہ قصبہ یا شہر عرفاً ایک ہی سمجھا جاتا ہے، گو کہ ان کا قیام مختلف محلوں میں ہو اور مختلف مساجد میں ہو، جیسے کہ حیدرآباد شہر میں مختلف مسجدوں میں قیام ہو تو عرفاً ایک شہر کا حصہ ہونے کی وجہ سے وہ مسافر نہیں کہلائیں گے، اگر شہر عرفاً ایک نہ سمجھا جائے تو حکم دوسرا ہوگا، بدائع میں ہے :

واما اتحاد المكان فالشرط نية مدة الاقامة فی مكان واحد ، لان الاقامة قرار والانتقال يضاده ، ولا بد من الانتقال فی مكانين و اذا عرف هذا فنقول اذا نوی المسافر خمسة عشر يوماً فی موضعين فان كانا مصرا واحدا او قرية واحدة صار مقيما لانهما متحدان حكما ، الا يری انه لو خرج اليه مسافرا لم يقصر فقد وجد الشرط وهو نية كمال مدة الاقامة فی مكان واحد فصار مقيماً ۔ (بدائع الصنائع: ۱/ ۹۸)

سماجی کاموں کیلئے غیر حاضری اور پوری تنخواہ لینا

سوال:- زید ایک اسکول کا ماسٹر بھی ہے اور رفاہی وسماجی کاموں میں بھی حصہ لیتا ہے،

غیر تدریسی مصروفیات کی وجہ سے اسکول کی پابندی نہیں ہو پاتی ہے، کبھی کبھی تو ایک مہینہ میں ۱۵/۱۶ حاضریاں ہی ہو پاتی ہیں تو کیا اس کو اس وجہ سے پوری تنخواہ وصول کرنا جائز ہوگا کہ سماجی خدمت میں وہ مصروف رہتا ہے۔ (شعیب احمد، حکیم پیٹ)

جواب:- ملازمت کے جملہ اوقات ملازم کے ذمہ امانت ہیں، اس امانت کا تقاضہ یہ ہے کہ پورا وقت اس کی ڈیوٹی کی تکمیل میں لگایا جائے، اس میں ذرہ برابر کمی نہ کی جائے، سورۂ تطفیف کی تفسیر میں مفسرین نے ملازمت کے اوقات میں کمی کرنے کو بھی تطفیف میں شمار کیا ہے، (معارف القرآن، سورۂ تطفیف) اس لئے ماسٹر صاحب کو اتنی ہی تنخواہ لینا جائز ہے، جتنی وہ ڈیوٹی کریں، اس سے زیادہ کی تنخواہ جائز نہیں۔

● ● ●

خبرنامہ
المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

مولانا عبیداختر رحمانی ☆

☆ ۱۹ر ستمبر ۲۰۱۸ء کو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے سیمینار ہال میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور معہد کے زیر اہتمام ایک علمی وفکری سمپوزیم کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں دو موضوعات زیر بحث آئے، علامہ شبلی نعمانی کے افکار پر پروفیسر محسن عثمانی ندوی (سابق ڈین اسکول آف عرب اسٹڈیز ای ایف ایل یونیورسٹی حیدرآباد) نے محاضرہ دیا، جب کہ علامہ اقبال اور فکر اسلامی پر جناب ضیاء الدین نیر صاحب نائب صدر تعمیر ملت نے گفتگو کی۔

☆ ۲۰ر ستمبر ۲۰۱۸ء کو المعہد العالی الاسلامی میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی جانب سے ''عالمی اداروں کے تعارف پر محاضرہ کا اہتمام کیا، اس موضوع پر ڈاکٹر مولانا سید حسنین ندوی نے محاضرہ دیا۔

☆ ۲۱ر ستمبر ۲۰۱۸ء کو معہد کے ایک فاضل مولانا رئیس احمد اشاعتی کی دعوت پر پونے کا سفر ہوا، انھوں نے پونے میں گونگے بہرے بچوں کے لئے مدرسہ قائم کیا ہے، جو پورے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحد مدرسہ ہے، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے مدرسہ کا جائزہ لیا اور خطاب بھی فرمایا۔

☆ ۲۲ر ستمبر ۲۰۱۸ء کو معہد کے ایک فاضل مولانا مسعود علی اشاعتی کی دعوت پر مہابلیشور کا سفر ہوا، مولانا مسعود علی اشاعتی وہاں کی جامع مسجد کے خطیب اور علاقے میں دینی وفلاحی کاموں میں پیش پیش ہیں، آپ نے پورے علاقے میں مکاتب کا جال بچھایا ہے، حضرت مولانا نے مکاتب کا معائنہ فرمایا اور وہاں کے مسلمانوں سے خطاب بھی کیا۔

☆ ۲۳ر ستمبر ۲۰۱۸ء کو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں جدید نظامہائے حکومت اور مغربی سیاست کے عنوان پر اُردو آرٹس کالج کے پروفیسر سید اسلام الدین مجاہد صاحب نے محاضرہ دیا، اس محاضرہ کا انعقاد اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور معہد کے اشتراک سے عمل میں آیا۔

☆ نگراں شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

☆ ۲۵-۲۶؍ستمبر ۲۰۱۸ء کو المعہد العالی الاسلامی میں ''ہندوستانی مذاہب کا تعارف اور انبیاء کرام کا تعارف، قرآن وسنت کی روشنی میں'' کے موضوع پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ کا انعقاد عمل میں آیا، اس تربیتی پروگرام کے محاضر مولانا مفتی سرور فاروقی ندوی تھے، پانچ نشستوں میں یہ دوروزہ تربیتی ورکشاپ مکمل ہوا، صدارت حضرت ناظم صاحب فرمائی اور آخری نشست میں سوال وجواب کا بھی سیشن رکھا گیا تھا۔

☆ ۳۰؍ستمبر ۲۰۱۸ء کو ملی کونسل کا تشکیلی اجلاس ہوا، جس میں حضرت مولانا شریک ہوئے، اس اجلاس میں حضرت مولانا کو سرپرست، جناب رحیم الدین انصاری صدر اور مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

☆ ۶؍اکتوبر ۲۰۱۸ء شعبہ تاہیل القیادۃ اور مطالعہ مذاہب کی جانب سے ''آر ایس ایس تنظیم اور طریقۂ کار وعیسائیت کا تعارف کے عنوان سے المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں پروگرام منعقد کیا گیا، اس پروگرام میں شعبہ تاہیل القیادۃ اور مطالعہ مذاہب کے طلبہ نے آر ایس ایس اور عیسائیت سے متعلق منتخب عنوان پر خطاب کیا، اس پروگرام کی صدارت معہد کے استاذ مفتی اشرف علی قاسمی صاحب نے فرمائی۔

☆ ۸؍اکتوبر ۲۰۱۸ء کو حضرت مولانا دارالعلوم وقف دیوبند کی مشاورتی میٹنگ میں شرکت کے لئے دیوبند تشریف لے گئے۔

☆ ۱۴؍اکتوبر ۲۰۱۸ء المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے شعبۂ ثقافت کے زیر اہتمام محاضرہ ہال میں حمد ونعت کی بزم سجائی گئی، جس میں حدیث، فقہ، تفسیر، مطالعہ مذاہب اور شعبۂ تحقیق کے طلبہ نے حصہ لیا، پروگرام کی صدارت حضرت ناظم صاحب نے فرمائی اور نظامت معہد کے استاذ مولانا محمد اعظم ندوی نے کی۔

☆ ۱۶؍اکتوبر ۲۰۱۸ء کو اسلامک فقہ اکیڈمی کی مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوئی، میٹنگ میں شرکت کے لئے حضرت مولانا دہلی تشریف لے گئے۔

☆ ۱۸؍اکتوبر ۲۰۱۸ء کو دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر (گجرات) میں حضرت مولانا عبداللہ کاپودرویؒ کی حیات وخدمات پر ایک سیمینار کا انعقاد ہوا، حضرت مولانا اس سیمینار میں شریک ہوئے اور حضرت کاپودروی کی حیات وخدمات پر اپنا مقالہ بعنوان ''حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی، دلِ دردمند اور فکر ارجمند کا حسین امتزاج'' پیش فرمایا اور افتتاحی نشست کی صدارت فرمائی۔

☆ ۳۱؍اکتوبر ۲۰۱۸ء المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے شعبۂ تاہیل القیادۃ کی جانب سے ایک ڈیبیٹ کا انعقاد کیا گیا، جس کا عنوان ''مسلم فیملی لاء میں حکومت کی دخل اندازی'' اس پروگرام کے اینکر معہد کے استاذ مولانا اعظم ندوی صاحب تھے، اس ڈیبیٹ میں ایک جانب ترجمان شرعیہ بورڈ، ترجمان جمعیۃ المشائخ

اور دوسری جانب ترجمان بے بھارت اور ترجمان آل انڈیا سیکولر فورم تھے، پروگرام کے مہمان خصوصی حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب تھے۔

☆ یکم نومبر ۲۰۱۸ء ظہر سے قبل قرآن فاؤنڈیشن میں ترجمہ قرآن کا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا، حضرت مولانا نے اجلاس کی صدارت فرمائی اور صدارتی خطاب کیا۔

☆ ۳-۸ر نومبر ۲۰۱۸ء الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین استنبول کے اجلاس میں شرکت کے لئے حضرت مولانا استنبول (ترکی) تشریف لے گئے۔

☆ ۷ر نومبر ۲۰۱۸ء المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے محاضرہ ہال میں معہد کے شعبۂ انگریزی کے صدر مولانا ناظر انور قاسمی صاحب نے ''تین سطحی ہندوستانی نظام حکومت'' کے عنوان پر محاضرہ دیا۔

☆ ۱۰-۱۱ر نومبر ۲۰۱۸ء المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے محاضرہ ہال میں معہد کے استاذ اور شعبۂ ثقافت کے ناظم مولانا محمد اعظم ندوی صاحب نے اقبال کی ''شکوہ جواب شکوہ کی تفہیم'' پر محاضرہ دیا۔

☆ ۱۳ر نومبر ۲۰۱۸ء کو جامعہ صفیہ نسواں نظام آباد میں ایک انتظامی مشاورتی میٹنگ ہوئی، حضرت مولانا اس مشاورتی اجلاس میں شریک ہوئے۔

☆ ۱۴ر نومبر ۲۰۱۸ء المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے محاضرہ ہال میں معہد کے استاذ مولانا انصار اللہ قاسمی صاحب نے ''قادیانیت'' کے موضوع پر اور مولانا مفتی شاہد علی قاسمی صاحب ناظم تعلیمات نے ''مہدویت اور بابائیت'' کے موضوع پر محاضرہ دیا۔

☆ ۱۵ر نومبر ۲۰۱۸ء میں حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب بنارس تشریف لے گئے اور بنارس میں علماء کی ایک نشست سے خطاب فرمایا اور اسی سفر میں سرائے میر کے مدرسہ بیت العلوم کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی اور خطاب فرمایا۔

☆ ۱۷-۱۹ر نومبر ۲۰۱۸ء اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا اٹھائیسواں فقہی سیمینار جامعہ اسلامیہ دارالعلوم محمدیہ میل کھیڑلا بھرپور (راجستھان) میں منعقد ہوا، حضرت مولانا شریک اجلاس ہوئے اور کلیدی خطاب فرمایا، جس میں ذہنی وفکری ارتداد کی خطرناکی کی جانب علماء کی توجہ مبذول فرمائی۔

☆ ۲۱ر نومبر ۲۰۱۸ء تعمیر ملت کے جلسہ سیرت النبی میں شرکت کی اور خطاب فرمایا اور اسی تاریخ کو بعد نماز عشاء عصر حاضر کے پورٹل کی انگلش سائٹ کے افتتاحی پروگرام میں شرکت فرمائی۔

☆ ۲۳ر نومبر ۲۰۱۸ء حضرت مولانا ماریشس، ری یونین اور دوبئی کے سفر پر روانہ ہوئے اور ان شاء اللہ حضرت مولانا کی ۱۱ر دسمبر ۲۰۱۸ء کو واپسی ہوگی۔

شمارہ نمبر: ۱۱۴، اکتوبر — دسمبر ۲۰۱۸ء

المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد اعلیٰ دینی تعلیم کا ممتاز ادارہ ہے، ہر سال طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد اور مسجد کی تنگ دامنی کو دیکھتے ہوئے مسجد کی توسیع کا فیصلہ کیا گیا ہے، فی الوقت یہاں دوسو علماء کرام زیر تعلیم ہیں اور پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہیں، اصحابِ خیر سے گزارش ہے کہ وہ مسجد کی تعمیر میں شرکت فرمائیں۔

Al- Alam Urdu Computers Hyd. +91 9959897621

RNI No: 1219775, RNI Tile-Code: APURD01946